آنسو اور موتی

آنسو اور موتی

نیائے شرما

ترتیب

۱- پیش لفظ (نریش کمار شاد) ۹

۲- ہار جیت ۳۲

۳- شکست اندر شکست ۵۶

۴- اور اندھیرا بڑھتا گیا ۷۳

۵- چناروں کی اوٹ میں ۹۳

۶- سمادھ ۱۱۱

۷- عظیم اللہ ۱۳۱

۸- پچھتاوا ۱۵۳

۹- بت مسکرا رہا تھا ۱۸۱

۱۰- آنسو اور موتی ۲۴۱

بار اول تعداد گیارہ سو

قیمت ساڑھے تین روپے

مینا گشی پبلیکیشنز چاوڑی بازار دہلی

مسٹر منموہن کپور کے زیر اہتمام فاروقی پریس دہلی سے شائع ہوئی

اُن آنسوؤں کے نام جو موتی نہ بن سکے

پیش لفظ

آج سے تین سال پہلے کی بات ہے ——

مجھے کانپور میں اپنے شاعر دوست کے پاس آئے ہوئے بمشکل دو تین دن ہی گزرے ہوں گے کہ ایک چلچلاتی ہوئی دوپہر کو جب سوتے سوتے اچانک میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ میرے دوست کے علاوہ دو اور صاحب سامنے کی چٹائی پر بیٹھے تھے اور ان تینوں کے درمیان ململ کا ڈھیلا ڈھالا کرتا اور کھدّر کی دھوتی پہنے ایک وجیہہ شکل انسان بیڑی کے لمبے لمبے کش لگاتے ہوئے کوئی کہانی سنا رہا تھا۔ چند لمحوں تک لیٹے لیٹے میں غنودگی کے عالم میں کچھ جملے سننے کی کوشش کرتا رہا لیکن میری عدم دلچسپی کے باوجود اس شخص کی وجاہت اس کی شخصیت اور اس کے بولنے کے رسیلے اور سحر کار انداز نے مل جل کر جیسے نیند کی ندی میں

بھنور ڈال دیئے اور مجھے مجبوراً نیچے چٹائی پر آکر ان لوگوں میں شریک ہونا پڑا۔

یہ نیاز شرما سے میری پہلی ملاقات تھی اور میں نے پہلی بار ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کا نام سنا تھا۔ تعارفی مسرت کے ساتھ ساتھ مجھے قدرے استعجاب اور تاسّف کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ کہ ایسا البیلا اور سحر کار فنکار آج تک ادبی حلقوں سے اوجھل کیوں رہا۔ اور پھر یہ ملاقات کئی ادبی محفلوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور مجھے متواتر ایک سال تک ان کی قربت نصیب رہی۔ ان کی عجیب و غریب حرکات و سکنات اور تحیر خیز حد تک لاابالیانہ اطوار کو دیکھنے کا موقع ملا

پہلی ملاقات ہی سے مجھے ان کے ساتھ جو والہانہ لگاؤ ہو گیا تھا ان کی مسلسل قربت سے اس کے نقوش اور بھی زیادہ گہرے ہوتے چلے گئے۔ بلاشبہ وہ حیرت انگیز دلچسپیوں اور خوبیوں کے مالک ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے اور ہر موضوع پر ان کی بات چیت اور بات چیت کرنے کا مخصوص لہکتا ہوا انداز اپنے اندر بے پناہ شگفتگی رکھتا ہے۔ اور پھر اس بات چیت سے جب ان کی ذہانت ان کی علمیت اور ان کے تجربے کی رنگارنگ دھاریاں پھوٹنے لگتی ہیں تو بے اختیار ان کے نطق کے بوسے لینے کو جی چاہتا ہے لیکن مجھے ان کی علمیت ان کے تجربے اور ان کی ذہانت سے زیادہ ان کی شرافتِ نفس نے متاثر کیا ہے۔ ایک سال کے دوران میں لاتعداد ایسے واقعات مجھے دیکھنے کو ملے جن سے بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ نیاز شرما اجتماعی اعتبار سے زندگی کو انتہائی صحیح سمجھنے کے باوجود انفرادی طور پر ایک معمولی آدمی سے دھوکا کھا سکتے ہیں

اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ایسے عالم میں جب انہیں اپنے کسی نہایت

ہی قریبی دوست عزیز یا رفیق کے سلوک کے پتھر سے غیر متوقع طور پر ٹھوکر لگتی تو چیخنے چلانے یا جھنجلانے کی بجائے ان کے پُر شکوہ اور پُر سکون چہرے پر ایک ٹھنڈے ٹھنڈے اور ہلکے ہلکے تبسم کی پرچھائیاں نو دینے لگتیں اور اس وقت یوں معلوم ہونے لگتا جیسے اس لو دیتے ہوئے تبسم کی عقابی نظریں جانتی ہیں کہ انسانی فطرت اتنی میلی نہیں ہے یہ میل ناہموار سماجی اقدار کی پیداوار ہے اور جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں انہوں نے اسی قسم کی ٹھوکریں کھا کر اپنے ذاتی تجربوں کو پورے سماج پر پھیلا دیا ہے اور اپنے قلم کی روشنائی سے اس میل کو دھونے کی شعوری کوشش میں ادب اور آرٹ کا سہارا تلاش کیا ہے

ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں میری معلومات زیادہ نہیں ہیں تاہم ان کی قربت اور رفاقت کی امداد سے میں نے ان کی زندگی کے ایسے چند موڑ ڈھونڈنے کی کوشش ضرور کی ہے جو ان کے ادبی اور فنی رجحانات پر گہرا اور نمایاں اثر رکھتے ہیں

وہ مشرقی پنجاب کے ایک متمول خاندان میں پیدا ہوئے لیکن ان کے والد کی زندگی کا اکثر حصہ اپنی ملازمت کے سلسلہ میں یو۔پی ہی میں گزرا۔ چنانچہ بنائے شرما نے اپنی ابتدائی تعلیم ڈیرہ دون۔ کانپور اور الٰہ آباد کے اسکولوں اور کالجوں میں حاصل کی۔ اور ان کی افسانہ نگاری کی ابتدا اس وقت ہوئی جب وہ کشمیر ناتھ سناتن دھرم انٹرمیڈیٹ کالج کانپور کے طالب علم تھے۔ وہاں پروفیسر ہری کرشن سکسینہ نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں بڑا اہم رول ادا کیا۔ اس کے بعد الٰہ آباد کے ماحول نے ان صلاحیتوں کو اور جلا بخشی اور ناظم وجدانی کے نام سے درمیانے درجے کے جرائد و رسائل میں ان کی کہانیاں چھپنے لگیں

جس زمانے میں انہوں نے افسانہ لکھنے کی ابتدا کی اس وقت افسانوی ادب کی محراب میں منشی پریم چند اور مہاشہ سدرشن کی قندیل جگمگا رہی تھی اور نئی پود کے اکثر و بیشتر لکھنے والے انہیں افسانہ نگاروں کی مقبولیت اور ادبی حیثیت سے متاثر ہو کر ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں کی طرح نیائے شرما کی اس دور کی کہانیوں پر بھی انہیں افسانہ نگاروں کے اثرات کی چھاپ ملتی ہے

الہ آباد سے تحصیلِ علم سے فارغ ہو کر اگر نیائے شرما کسی سیدھے سادے ہندوستانی متوسط طبقہ کے نوجوان کی طرح اپنی زندگی کو کسی عام فہم اور مشینی قسم کی ترتیب کے سانچے میں ڈھال لیتے تو شاید وہ آج کے نیائے شرما سے ناقابلِ شناخت حد تک مختلف ہوتے۔ ان کی شخصیت۔ ان کی پوری نفسیاتِ زندگی اور زندگی کے متعلق ان کا موجودہ رویہ بالکل جداگانہ ہوتا۔ لیکن ان کے لاابالیانہ مزاج نے ان کی انفرادیت کی لاج رکھ لی۔ اور نے نکھار سنوار کر اس قابل بنا دیا کہ وہ آج زندگی کے گوناں گوں پہلوؤں سے خطرناک حد تک آگاہ ہیں لیکن اس لاابالیت کے دوران میں بھی وہ اپنی شخصیت کے خاکوں میں ایک چابک دست مصور کی طرح کئی طرح کے رنگ بھرتے رہے۔ انہوں نے کئی زبانیں سیکھیں۔ کئی زبانوں کے ادب اور فلسفے کا مطالعہ کیا اور کئی طرح کے کرداروں سے مل کر انسانی فطرت کے مختلف مظاہر کو دیکھنے اور جانچنے کی جدوجہد کی۔ راگ ودیا اور جوتش میں مہارت حاصل کی۔ فلمی کہانیاں لکھیں۔ زندگی کے مختلف مقامات پر اپنے ذہن کے دامن کو حیرت انگیز حد تک نت نئی معلومات اور نت نئے مشاہدات سے بھرپور کیا

اور اسی دوران میں مشہور بنگالی مصنف سرت چندر چٹو پادھیائے سے ان کی راہ ورسم پیدا ہو گئی۔ نیائے شرما کو بنگالی ادب سے جو گہری وابستگی ہے اُس کی بہت حد تک ذمہ داری اسی راہ ورسم پر ہی عاید ہوتی ہے۔ سرت کی فنی پختگی اور رچاؤ سے نیائے شرما بہت متاثر ہیں اور اپنی کہانیوں کے مجموعی تاثر کو گمبھیر اور پائدار بنانے میں سرت چندر کے اسلوب اور تکنیک نے انہیں بہت آسرا دیا ہے۔

ان کی صحرانوردی کا یہ پہلو خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ انہوں نے زندگی کی کسی سٹیج پر بھی مطالعہ کا دامن نہیں چھوڑا۔ اس مطالعہ کا اطلاق ان کے محبوب مصنفین سرت چندر، شیکسپیئر، گورکی، اور شولوخوف کی تصنیفات پر ہی نہیں روزمرہ زندگی کے سماجی اور اقتصادی مسایل پر بھی ہوتا ہے۔ مختلف وقتوں اور وقت وحالات کی مختلف کیفیتوں میں ان گنت کردار اپنی نئی نئی الجھنوں نئے نئے دکھوں اور نئی نئی خوشیوں کے ساتھ ان کے ذہن و جذبات کی دنیا میں داخل ہوتے گئے اور ان کی تخلیقی صلاحیتیں ان الجھنوں۔ ان دکھوں اور ان خوشیوں کی تہ میں اتر اتر کر افسانوں اور کہانیوں کا روپ دھارن کرتی گئیں

انہیں یقیناً اپنے ان کرداروں کے ساتھ بڑا طول طویل سفر بھی کرنا پڑا ہو گا۔ کئی ٹیڑھے میڑھے خارزار راستے بھی الانگنے پھلانگنے پڑے ہونگے۔ کئی دفعہ ان کے ساتھ قتل تک ہو جانا پڑا ہو گا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں انہیں جذباتی اور ذہنی صعوبتوں کی کڑکتی دھوپ میں تپ کر ہی ان کا فن اتنا موثر، حسین اور تابناک ہوا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ وہ اپنی ذات کے خول سے باہر نکل کر پوری انسانیت میں اپنے آپ کو مدغم کرنے میں کامیاب ہو گئے

"آنسو اور موتی" کی تقریباً تقریباً تمام کہانیاں اس امر کا ناقابلِ تردید ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ ان کے سینوں میں نیشلے اور نشاط آگیں رومانوں کے فانوس ہی نہیں جلتے۔ سیم گوں پائلوں کے چھناکے ہی نہیں گونجتے۔ عنبریں اور حسین زلفوں کے گھنے سائے ہی نہیں لہراتے ایک انسانیت نواز اور چوٹ کھائے ہوئے دل کی دھڑکنیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ ایک حساس اور باشعور انسان کا صاف ستھرا تفکر بھی جھلک مارتا معلوم ہوتا ہے۔ ان کہانیوں میں انہوں نے ایسے ناموافق حالات اور وہ نابکار چہرے بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے جو زندگی کو آگے بڑھنے سے روکتے ہیں اور انسانی ارتقا کے پہیئے کو الٹا گھمانا چاہتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس مجموعہ کی پہلی کہانی "ہار جیت" کو لیجئے۔ انسانی محبت کے کھیل میں بسا اوقات حالات کچھ ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ ہار اور جیت کے جذبے اپنے معنوی تضاد کے باوصف ایک ہی زنجیر کی دو کڑیاں معلوم ہونے لگتے ہیں۔ بنا تے شرما نے اپنی اس کہانی کی عمارت کچھ ایسے ہی حالات پر استوار کی ہے۔ اور ہندوستان اور پاکستان کے فسادات کے پس منظر سے کہانی کے پلاٹ کا خمیر اٹھایا ہے۔ شروع سے آخر تک سبھی کرداروں کے ذہنی خطوط پر رومانیت کی ہلکی پھلکی بدلیاں چھائی رہتی ہیں لیکن محبت اور رومان پر بھی چونکہ سرمائے کا اجارہ ہے۔ اور دیویندر سماجی اعتبار سے ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتا ہے جسے اس مہاجنی سماج میں محبت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اس لئے وہ اس پوری رومانی فضا میں دوسرے کرداروں سے کٹا کٹا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے دوست اور اس کی محبوبہ اس کے احساس پر متواتر طنز اور تضحیک کے نشتر چلاتے رہتے ہیں اور ان نشتروں کی بوچھاڑ میں کہانی کے اختتام پر دیویندر

کا خلوص اور اس کی محبت کی گمبھیرتا بڑی شدت سے ابھرتی ہے اور قاری محسوس کرتا ہے جیسے دیویندر کی بجائے گولی اس کے اپنے سینے میں لگی ہو۔ یہاں کہانی کے دوسرے کرداروں اور دیویندر میں افسانہ نگار نے ایک ایسی تمیز روا رکھی ہے جس کا بھرپور انکشاف کہانی کی آخری سطور پڑھنے کے بعد ہوتا ہے۔ دیویندر ہنسا کے روپ میں دراصل پوری انسانیت کی نگہبانی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور اس فرض کو سرانجام دیتے ہوئے اسے اپنی جان تک کا بلیدان دینا پڑتا ہے

"شکست اندر شکست" پر بھی اداس اداس رومانیت محیط ہے اور اس رومانیت کو کہانی کے موسیقانہ ماحول نے اور بھی اثر انگیز اور دلکش بنا دیا ہے کہانی کا اسلوب اور بیان بھی خالصتاً موسیقانہ ماحول میں ڈوبا ہوا ہے یہاں تک کہ تشبیہیں اور استعارے بھی موسیقی سے متعلق ہیں جیسے کملا کے حسن و جمال کا نقشہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

"باگیشری جیسی وہ بھولے بالوں والی نازک اندام لڑکی دنیا بھر کی رنگینیوں کو اپنے ساتھ سمیٹ لاتی تھی اور مال کونس کی پردرد ہوک چھوڑ کر چلی جاتی تھی۔ اس کے الفاظ جے جے ونتی اور گن ملی کے میٹھے میٹھے سحر انگیز نغموں میں تحلیل ہو کر اس کے نعلیں ہونٹوں پر مچلتے تو گویا بسنت اور ملت کی مستیاں لوٹ پوٹ ہونے لگتیں۔ وہ بڑی بڑی آنکھوں والی سبک مزاج کملا سراپا سنگیت تھی ——"

دونوں کے اظہارِ محبت کی تصویر بھی بڑی نازک اور لطیف اشاریت کے ساتھ اسی موسیقانہ فضا کے رنگوں سے کھینچی گئی ہے۔

" کملا بہت سنجیدہ ہو گئی۔ وہ بولی۔ آپ نے سکھایا ہے کہ اگر لے درست جا رہی ہو تو اس کو بلمبت کر دینے سے راگنی کا ٹھاٹھ نہیں بگڑ جاتا ہے۔"

اس نے کہا تھا " ہاں کملا"

اور کچھ دیر کے لئے دونوں ہی چپ ہو گئے تھے اور پھر وہ سوچتے سوچتے بول اٹھا تھا " راگنی کے ٹھاٹھ کو بگاڑے بغیر راگنی کو درلست سے بلمبت بھی تو وہی فن کار کر سکتا ہے جس کو یہ یقین ہو کہ یہ راگنی اس کی اپنی راگنی ہے اور اسے اپنی اس راگنی پر اختیار ہے "

کملا نے سر جھکاتے ہوئے کہا تھا " کبھی کسی راگنی نے کسی فن کار سے یہ تو ہرگز نہ کہا ہو گا کہ اسے اس پر اختیار ہے ــــــ"

اس نے کہا تھا " مگر راگنی احساس تو کرا دیتی ہے "۔

کملا کے لہجہ میں حیا کی پاکیزگی تھی جب اس نے کہا تھا " اور اگر راگنی کو احساس کرانا ہی نہ آتا ہو " اور اتنا کہتے کہتے اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا مگر کملا کی اپنی اس پہیلی نے اس کی اپنی زندگی کی پیچیدہ ترین پہیلی کو ایک ہی لمحہ میں سلجھا کر رکھ دیا تھا ــــــ"

اس کہانی میں بھی ایک متوسط طبقے کا نوجوان آرٹسٹ دیو بندر کی طرح ایک بورژوا لڑکی کی محبّت میں مبتلا ہو کر طبقاتی کشمکش کو چیلنج کرتا ہے اور اس محبّت کے صلے میں سماج کی طرف سے اسے ایک شکست ملتی ہے۔ وہ ناکام ہو جاتا ہے لیکن شکست کا یہ سلسلہ یہیں نہیں ٹوٹ جاتا۔ بلکہ اس شکست کی کوکھ سے ایک اور شکست جنم لیتی ہے۔ سماجی ماحول اس وقت اس محبّت کو جائز قرار دیتا ہے جب اس کی محبوبہ زندگی کے متواتر جہاد سے ٹوٹ کر نڈھال ہو کر موت کی آغوش میں سکھ کا سانس لے رہی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی

فن کار کی دو گونہ شکست کی ذمہ داری اس کے رومانی دل و دماغ سے زیادہ سماج کی بے بصری، طبقاتی تقسیم اور اس نظامِ زندگی کے اوٹ پٹانگ رسم و رواج پر عائد ہوتی ہے

"اور اندھیرا بڑھتا گیا" تجربے کی گہرائی اور مشاہدے کی وسعت کی بیک وقت بڑی حسین اور دردناک تصویر ہے۔ اور اس تصویر میں ایسے بیش تر نوجوانوں کے ذہنی خدوخال جھلکتے ہیں جن کی آوارہ مزاجی اور خام کاری ایکٹر بننے کی دھن میں بمبئی کا رخ کرتی ہے۔ اور وہاں اس ماحول کی اصلیت اور زمانے کی پے بہ پے ٹھوکریں اکثر اوقات نہایت بے دردی اور سنگینی سے ان کے مزاج کو ہموار کرتی ہیں۔" اور اندھیرا بڑھتا گیا" ایک ایسے ہی آوارہ مزاج نوجوان کی کہانی ہے۔ کرداروں کے نفسی تجزیے اور ان کی داخلی کیفیتوں کے زیر و بم کافی سوجھ بوجھ اور فن کارانہ گہرائی کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ خاص طور پر بڑے بھیا کا کردار اس ضمن میں کافی اہم ہے۔ بڑا بھیا ایک سائے کی طرح اس نوجوان کی لاابالیانہ شخصیت کے پیچھے پیچھے چلتا ہے اور یہ سایہ عین اس وقت اپنی پوری محبوبیت اور رعنائی کے ساتھ ایک صحت مند انسان کے رنگ روپ میں سامنے آتا ہے جب اس کا چھوٹا بھائی (آوارہ مزاج نوجوان) ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں امراض سے گلے سڑے جسم کے ساتھ پوری فلمی دنیا کی جاذبِ نظر اور رنگین و رعنا فضاؤں پر ایک گھناونا طنز بنا ہوا ہوتا ہے اور اسے ساری کائنات اندھیرے کے ایک اتھاہ سمندر میں ڈوبتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس وقت بڑے بھیا کا خلوص جسے وہ اپنی خام کاری کے باعث بے رحمی اور تشدد سے تعبیر کرتا رہا تھا روشنی کا مینار بن کر اس کے بیمار احساس اور مرجھائی ہوئی جاں بلب زندگی کو اپنی

آغوش میں لے لیتا ہے

"چناروں کی اوٹ میں" منظر کشی اور تشبیہات کے اعتبار سے بڑی دل نشیں کہانی ہے۔ اس میں مصنف نے کہانی کے گرد ایک مرد اور دو عورتوں کی ٹرائینگل کا احاطہ کرکے دو عورتوں کی باہمی رفاقت کے فطری جذبے کو بڑے حسین اور گہرے انداز میں اجاگر کیا ہے شروع شروع میں تمام کرداروں کے نقوش بہت مدھم اور ہلکے ہلکے رنگوں میں ابھارے گئے ہیں۔ لیکن جوں جوں کہانی آگے چلتی ہے یہ رنگ شوخ اور پُرکشش ہوتے جاتے ہیں اور ان رنگوں کی اوٹ میں چھپے ہوئے ان کے داخلی اور نفسیاتی محرکات کی طرف بھی بڑے بلیغ اشارے کیے گئے ہیں۔

خاص طور پر اس کہانی کا آخری حصّہ بے حد موثر ہے۔ جس میں جیون اپنی بیوی للتا کے انتقال کی خبر اپنی مالکہ وینا کو سناتا ہے۔ وینا پر اس خبر کا ردِ عمل اور خود افسانہ نگار کا ردِ عمل دونوں ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے ترچھے آڑے جذبے چند لفظوں میں ایک مستقل کرب بن کر اس ٹریجڈی کا انجام بن گئے ہیں۔

"۔۔۔۔۔۔ اور ایک رات جب چاند اپنی کرنوں کو چندر مکھی کے سر پہ نچھاور کر رہا تھا۔ رات رانی کا تبسّم لطیف خوشبو بن کر فضاؤں میں تحلیل ہو رہا تھا چناروں کی نرم کونپلیں وجد میں جھوم رہی تھیں۔ سفیدے کے لمبے لمبے سائے متحرک رہے تھے۔ حوض کا نیلگوں پانی ہلکی ہلکی لہروں کے تار پر شیام کلیان کا مدھر گیت گا رہا تھا جیون نے وینا کو تار دیتے ہوئے کہا۔ "للتا مر گئی ہے"۔

وینا پر سکتے کا دورہ پڑا۔ اس نے پوچھا "کب"

جیون نے جواب دیا "کل"

کچھ دیر کے لئے دونوں خاموش ہو گئے۔ پھر جیون خود ہی بولا "تپ دق کا علاج دنیا میں کہیں نہیں ہے۔"

وینا خاموش رہی اور دور بہت دور کلو کی فلک بوس پہاڑیوں کی آغوش میں ندی کے کنارے للتا کی چتا بھڑک بھڑک کر خاموش ہو چلی تھی ——— وینا کی پلکوں پر آنسو آ گئے۔ وہ بولی۔ "کتنے انتظار کی زحمتوں کے بعد خدا نے جیون تمہیں میرا بنایا ہے" اور یہ کہہ کر اس نے جیون کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا

جیون کی انگلیاں وینا کے گیسوؤں میں الجھ گئیں۔ پرند چہچہا اٹھے۔ چاند کی شعاعیں حوض کی لہروں سے کھیلنے لگیں۔ رات رانی نے خوشبوؤں کی جھولیاں الٹ دیں۔ اور دور جہاں پیپل کی ننھی ننھی ٹہنیاں سبزے پر ٹلاتی لاکھ کے قطرے چھڑک رہی تھیں وہاں چناروں کی اوٹ میں جھولا اب بھی پڑا تھا ———"

جھولے کا تصوّر دے کر مصنّف نے جس خوبصورتی اور رقت بھرے انداز میں للتا کی تصویر کھینچی ہے اس کی داد نہیں دی جا سکتی

ثیا شے شرما نے ہندوستان کی تاریخِ ماضی کی گپھاؤں سے بھی کچھ ایسے کردار ابھار کر اپنے افسانوں کے راج سنگھاسن پر بٹھائے ہیں جو اپنے وقت اور اپنے زمانے میں آدمیت اور آدمیت کے تقاضوں کے نمائندہ تھے۔ عظیم اللہ ایک ایسا ہی کردار ہے۔ ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی کے پس منظر سے اس انقلابی ہیرو کی عظمت کے جن نازک اور لطیف پہلوؤں سے انہوں نے نقاب کشائی کی ہے۔ یہ انہیں کا حصّہ ہے۔ ساری کہانی کی فضا میں جیسے عظیم اللہ کے باغیانہ دل و دماغ کی حدّتیں کچھ اس طرح گھل مل گئی ہیں کہ ایک ایک لفظ شعلے کی طرح دہکتا ہوا

محسوس ہوتا ہے اور آخر ہیں جب ہیولاک عظیم اللہ کے مکان کی تلاشی لیتے لیتے اچانک ایک سیاہ آبنوس کی صندوقچی کو کھول کر دیکھنے لگتا ہے تو افسانہ نگار یہ کہہ کر ہیولاک کی توقعات اور اس کی دختران وطن کی عفت و عصمت پر استہزائیہ قہقہہ لگا کر عظیم اللہ کی عظمت کو اور بھی دوبالا کر دیتا ہے کہ

"—— اچانک ہیولاک کے ہاتھ سیاہ آبنوس کی ایک صندوقچی لگی۔ انگریز حاکم کی نگاہوں میں امید روشنی بن کر ناچ اٹھی۔ فوراً قفل توڑا گیا۔ صندوقچی میں ان انگریز دوشیزاؤں کے محبت نامے تھے جو انہوں نے اپنے ڈارلنگ عظیم اللہ کو لکھے تھے ——"

سمادھ اگرچہ پورے طور پر تاریخی کہانی نہیں ہے لیکن، افسانہ نگار کے ذہن میں اپنی موجودہ معاشرت کے کرداروں کے دوش بدوش ماضی کی تاریخ کے کردار بھی چلتے ہیں ایک کہانی میں دو کہانیوں کی متوازی لہریں چلتی ہیں اور انجام کار یہ دونوں لہریں گتھم گتھا ہو جاتی ہیں اور افسانہ نگار محبت کو انسانی زندگی کے ماضی اور حال کے پس منظر میں جانچ کر یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ آج تک اپنے معاشی نظام کی غلط قبیلوں کی وجہ سے انسان اس حد تک لالچی اور حریص بنتا رہا ہے کہ دنیا بھر کی تسکتی کو اپنے ہاتھوں میں سمیٹ لینے کے لئے اپنے بچوں کے خون تک کی بازی لگا دینے سے بھی اس نے گریز نہیں کیا۔

"پچھتاوا" ایک ایلٹرا ماڈرن ہندوستانی خاتون کی بے راہ روی پر ایک عبرت آموز طنز ہے۔ انجینیر کا کردار بظاہر نہایت خاموش اور پھیکا سا معلوم ہوتا ہے لیکن اس خاموشی اور پھیکے پن میں بھی زندگی اور خلوص کے عناصر کار فرما ہیں لیکن ایلٹرا ماڈرن خاتون نے اپنے

ذہن و دماغ میں رومانیت کا کچھ ایسا تانا بانا بنا ہوا ہے کہ اس کی آنکھیں ان عناصر کو نہیں بھانپ سکتیں اور آخر میں جب اس رنگین تانے بانے کو حقیقت اور اصلیت کی ضرب توڑ کر رکھ دیتی ہے اور اس کے نشیلے خوابوں کی کڑیاں ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں تو اس کے احساس و شعور کی آنکھیں کھلتی ہیں۔ اور اس طرح احساس کی بصیرت اور شعور کی بصارت اس کی ازدواجی زندگی میں ایک خوشگوار انقلاب کا موجب بنتی ہے

اس کہانی کا ایک اور اہم اور قابلِ ستائش پہلو یہ ہے کہ مصنفؔ نے جہاں پارو (رقاصہ) کے ماحول کی عکاسی کی ہے وہاں جزئیات نگاری کی حد کر دی ہے اور یہ جزئیات نگاری وہاں تو واقعی ایک مستقل فن بن گئی ہے جہاں مصنفؔ نے فنِ رقص کے بارے میں اپنی وسیع اور تاریخی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اور دیومالا کے گہرے مطالعہ کو بنیاد بنا کر فنِ رقص کی بنیادی غرض و غایت کا تجزیہ کیا ہے۔ "اور ستی کی لاش کو کندھے پر رکھ کر شو دنیا کے کونے کونے میں بھٹکنے لگے۔ ہمالیہ کے روتے ہوئے آبشاروں نے انہیں اور مغموم کر دیا۔ وادیوں میں چٹکی ہوئی کلیوں کے پھٹے ہوئے دامنوں کو دیکھ کر وہ اور تڑپ اٹھے۔ کالی گھٹاؤں کی پُر ہول سسکیوں نے ان کا رہا سہا قرار بھی چھین لیا۔ نہ ختم ہونے والی فرقت کی گھڑیوں نے انہیں دیوانہ بنا دیا۔ ان کے صبر کے پاؤں ڈگمگا گئے۔ ان کے قدموں کو حرکت ہوئی۔ شو تانڈو کی تخلیق ہو اٹھی۔ دنیا دہلنے لگی۔ چاروں طرف ہاہاکار مچ گئی۔"

یا جیسے ایک جگہ کام رتی کے بولوں کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے کہانی کے ایک کردار پنڈت جی کی زبان سے کہلوایا گیا ہے۔

"شیو جی نے کام دیو کو بھسم کر دیا۔ دنیا کانپ اٹھی۔ سنسار کی تخلیق بند ہو جائے گی۔

اس خیال سے دیوتا لرز اٹھے اور کام دیو کی محبوبہ رتی کے جذبات کی دُنیا تہ وبالا ہو گئی۔ وہ روئی۔ وہ چلّائی۔ وہ گلاب کی پتی پر شبنم کے قطرے کی طرح کانپتی ہوئی شیو کے حضور میں دوزانو ہو گئی۔ وہ اپنے کام دیو کے جیون کی بھیک مانگ رہی تھی۔ اس کا دل اس کے آنسوؤں میں بہا چلا جا رہا تھا۔ وہ چلّائی مہاراج! اب دُنیا میں محبوبوں کی ملاقات نہ ہو گی۔ برساتیں انگارے اگلنے لگیں گی۔ بسنت کا موسم سیاہی کا لبادہ اوڑھ لے گا۔ ساون کے بادل شعلے برسانے لگیں گے۔ کوئلیں کوکتی کوکتی مر جائیں گی پپیہوں کے جگر پھٹ جائیں گے اور آپ کی پاروتی بھی تو خون کے آنسو روتی روتی آنکھوں کی جوت سے محروم ہو جائے گی۔ شیو کو رحم آ گیا۔ انہوں نے کام دیو کو جیون دان دے دیا۔ آسمان میں نقّارے بجنے لگے۔ فضا میں نفیریوں کی صدا گونج اٹھی پرہمیوں نے شنکھ پھونک دئیے ــــــ"

انداز بیاں کی اس فنی خوبی کے ساتھ ساتھ اس کہانی میں مصنف کے سماجی شعور کی بالغ نظری اور دُور رسی بھی قابل غور ہے۔ افسانہ نگار اس اٹل اور مکروہ حقیقت سے بے خبر نہیں ہے کہ سرمایہ دارانہ سماج میں آرٹ نہیں پنپ سکتا۔ یہاں اس کی ساری عظمت بھُوک اور پیاس کے بازاروں میں نیلام ہو جاتی ہے

ایک طرف اگر کوتاہ گردن سیٹھ نے پارو کو فنی رعنائیوں کے ساتھ ساتھ اپنے بدن کے ایک ایک زاویے تک کو فروخت کرنے کے لیے مجبور کر رکھا ہے تو دوسری طرف اس کے چاندی کے تاروں نے پنڈت جی ایسے نیک دل اور منجھے ہوئے جہاندیدہ فنکار کے ضمیر کو بھی جکڑا ہوا ہے اور وہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ایک تعفن آمیز گھٹن ہے۔ جو پارو کے سارے ماحول پر چھائی ہوئی ہے اور جس کے زیر سایہ

آرٹ کے یہ پجاری ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اپنے آپ کو زندہ رکھ رہے ہیں

نیائے شرما نے چھوٹے چھوٹے واقعات کا سہارا لے کر کافی شدت اور کامیابی سے اس گھٹن کی پوری کیفیت کو اپنی کہانی کی مجموعی فضا میں سمونے کی کوشش کی ہے

"اور بت مسکرا رہا تھا" انسانی جذبات اور شعور کی کشمکش کی بڑی دلچسپ داستان ہے افسانہ نگار نے بڑی گہرائی اور دور بینی سے کہانی کے ہیرو راکیش کے دل و دماغ کی داخلی کیفیتوں کے نہاں خانوں میں جھانک کر یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ ایک الجھے ہوئے نظام حیات میں جذبات اور شعور کی یہ کشمکش کس طرح مہلک اور جان لیوا ثابت ہوتی ہے

راکیش ایک ایسا کردار ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر اپنے دل و دماغ میں ایک تصادم پاتا ہے اور ہر مرتبہ اس تصادم کا نتیجہ کسی نہ کسی حادثے کی شکل میں رونما ہوتا ہے اور ان مختلف حادثوں کی کڑیوں کے ملنے سے کہانی بن جاتی ہے لیکن حوادث کے اس صنم خانے میں راکیش کے والد کا بت اس وقت تو واقعی کسی جیتے جاگتے کردار کی طرح کہانی کی فضا میں سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے جب راکیش اپنے ضمیر کی آواز کی بازگشت اس بے جان مجسمے میں گونجتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اگر راکیش کو اپنے کسی اقدام پہ خوشی کا احساس ملتا ہے تو اسے اس بت کے سنگین سینے سے بھی مسرت اور انبساط کی چمکیلی لہریں پھوٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً جس دن راکیش رینو کا کو موت کے منہ سے بچاتا ہے۔ اسی رات اپنے والد کے بت کو دیکھ کر وہ سمجھتا ہے۔

"بت کی نگاہوں میں چمک ہے۔ اس کے لبوں پر تبسم ہے۔ اس کے چہرے

کی لکیروں پر جذبات کی ایک سنجیدگی انگڑائی لے رہی ہے"

اور جب کسی ناکامی اور محرومی کا احساس اس کی روح کو افسردہ کر دیتا ہے تو اسے بے روح بت کا دل بھی بجھا بجھا دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً جب دنیا اس پر طرح طرح کے الزام دھرتی ہے۔ رضا کار اسے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور آشرم بند ہو جاتا ہے ایسے عالم میں جب وہ بت کی صورت دیکھتا ہے تو اسے یوں معلوم ہوتا ہے

"جیسے بت کے چہرے پر بھی کوئی جذبہ نہیں۔ اس کی آبدار سطح پر محض چراغ کی لو کا گلابی پرتو مر مر کر جھلملا رہا ہے۔ بت تراش کے ہلکے پھلکے اوزاروں نے جو نقوش جہاں تراش دئے تھے وہ جوں کے توں تھے۔ خنک، سخت اور بے لوچ ——"

اور جب وہ اپنے ضمیر کو مجرم محسوس کرتا ہے تو اسے بت کی پتھریلی آنکھوں سے آنکھیں ملاتے ہوئے بھی حجاب محسوس ہوتا ہے۔ سر بہ سجود ہو کر بت کے حضور میں اپنا گناہ بخشوانے کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔ لیکن بار بار کوشش کے باوجود بت کا سامنا نہیں کر سکتا

والد کا بت دراصل راکیش کے اپنے پندار کا آئینہ ہے جس میں وہ اپنے ذہن و احساس کی نازک سے نازک داخلی کیفیت کا عکس بھی دیکھ لیتا ہے اور اپنے دل و دماغ کے میدان کارزار میں حادثات کی مسلسل چوٹوں سے جب اس کا پندار چکنا چور ہو جاتا ہے تو وہ والد کے بت کو بھی توڑ کر اپنی ذہنی فراریت کے ڈانڈے موت سے ملا دیتا ہے۔

کہانی کا آخری حصہ پڑھتے وقت آسکر وائلڈ کی پکچر آف ڈورین گرے کا خیال آنے لگتا ہے حالانکہ دونوں مصنفوں کے درمیان مشرق اور مغرب کے بعد کی جغرافیائی

چٹانیں حائل ہیں۔ اور دونوں کے سماجی حالات اور تمدنی فضا میں بھی کافی غیر مناسبت ہے لیکن پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیائے شرما کی سوچ اور فکر کی پرواز آسکر وائلڈ کے ذہنی ارتقا سے ہم آغوش ہو گئی ہے

"آنسو اور موتی" اس مجموعہ کی آخری طویل مختصر کہانی ہے جس میں ایک سرمایہ دار دیودت کے سماجی رول کو عریاں کیا گیا ہے۔ جو زندگی کی مختلف سٹیجوں پر گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا دکھائی دیتا ہے

سرمایہ دارانہ سماج کا مکروہ ترین اور لرزہ خیز کارنامہ یہ ہے کہ وہاں حیاتِ انسانی کے بازار میں چاول کے دانے سے لے کر عورت کی عصمت تک کے دام مقرر ہیں۔ دیودت اسی سماجی مشین کا ایک پرزہ ہے۔ اور جہاں اس کی استحصالیت کی چھری مزدور اور محنت کش طبقے پر چلتی ہے۔ وہاں اس کی ہوس کا ناگ معصوم و مجبور عفتوں کو بھی ڈستا ہے

نیائے شرما نے کافی باریک بینی سے دیودت کی اندرونی زندگی کی تصویر کشی کی ہے کہ کس طرح وہ یک لخت سوٹ بوٹ کو تیاگ کر اپنی مکارانہ ذہنیت پر کھدری نقاب اوڑھ لیتا ہے تاکہ عوام اور حکومت دونوں کو دھوکا دے سکے مگر اس کی سرشت میں اندر ہی اندر پروان چڑھتے ہوئے پرانے خصائل جب بالاخر لاوے کی طرح پھٹ پڑتے ہیں۔ تو وہ آشا کے سامنے یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ

"اب میری روح کسی دباؤ کے تلے مری جا رہی ہے۔ میں یہ بہروپ کتنے دن تک بھرتا رہوں گا۔ مجھے کھدر پر قطعی یقین نہیں ہے میں اپنے اصلی روپ

میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں ان پھیکی پھیکی شاموں کے بے کیف خاکوں میں شراب کے چھینٹوں سے سرخ رنگ بھر دوں۔ کھنکتی ہوئی راتوں کو اور کھنکا دوں۔ میں تو وقتی آ گیا ہوں اس سنیاسی دنیا سے ——"

اور پھر جب اس کے کارخانے کے مزدور اپنی مانگیں منوانے کے لئے ہڑتال کر دیتے ہیں اور ان کا ہجوم دیودت کی کوٹھی کے پھاٹک پر جمع ہو جاتا ہے تو افسانہ نگار بڑی صداقت، اور بے باکی سے دیودت کی لوٹ کھسوٹ کے شیطانی جذبے کا ایک اور پول کھولتا ہے

دیودت منیجر سے پوچھتا ہے کہ ان لوگوں کے کیا مطالبات ہیں اور جب منیجر بتاتا ہے کہ یہ لوگ کارخانہ میں ہسپتال چاہتے ہیں اور مہنگائی الاؤنس اور مزدوری میں اضافہ کا تقاضا کرتے ہیں تو دیودت اپنے ماتھے پر ایک شکن تک ڈالے بغیر ان مطالبات کو تسلیم کر لیتا ہے۔ اور منیجر خیر خواہی جتاتے ہوئے جب ایسا کرنے کی وجہ دریافت کرتا ہے تو افسانہ نگار دیودت کے منہ سے یہ جملے کہلوا کر گویا پورے سرمایہ دارانہ نظام کے منہ پر تھوک دیتا ہے کہ

"تم نہیں سمجھتے ہو ہسپتال کی عمارت کا خرچ انکم ٹیکس سے کٹ جائیگا اور ہاں ان کے رہنماؤں پر نظر رکھو۔ دو مہینے کے اندر اندر انہیں کسی نہ کسی بہانے کارخانے سے نکال دو اپنے راہ نما کھڑے کرو ——"

اس طرح اور کئی چھوٹے چھوٹے واقعات اور حقائق کی روشنی سے مصنف نے اس خونی اور انسانیت سوز تہذیب کو بے نقاب کیا۔ دیودت جس کا ایک ادنے نمائندہ ہے

کہانی کے عنوان "آنسو اور موتی" کا بھرتو شروع سے آخر تک دیودت کے ہاتھوں بکے ہوئے کرداروں پر پڑتا رہتا ہے اور یہ پرتو اختتام پر کسی دھند لکے سے ایکا ایکی صبح کی نورانی شعاعوں کے پھوٹنے کا منظر پیش کرتا ہے جب راجو آشا کو ایک خالی زنانہ ڈبہ میں بٹھا کر چلا جاتا ہے اور آشا کی پرانی ملازمہ متعجب ہو کر استفسار کرتی ہے

"——— بی بی جی آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

اور آشا یہ سن کر آبدیدہ ہو جاتی ہے۔ کون جانتا ہے کہ آشا کی آنکھوں میں یہ مظلومی اور فلاکت کے آنسو ہیں یا دیودت کے آویزے کے کچھ موتی پگھل پگھل کر بہہ رہے ہیں۔ اور اس طرح ایک مظلوم اور آبرو باختہ عورت کی بلکتی ہوئی آنکھیں بیک وقت آنسوؤں اور موتیوں سے بھری ہوئی معلوم ہوتی ہیں

اس مجموعہ کی کہانیوں میں پلاٹ کی جامعیت کے علاوہ اسلوب اور بیان کی ندرت خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ ہے۔ بات یہ ہے کہ نیائے شرما کی زندگی کا اکثر حصہ فلمی دنیا میں گزرا ہے اور فلمی اثرات ان کے فنی لالہ زار پر بھی بہار کی طرح چھائے ہوئے ہیں۔ کہانیوں میں جا بجا مکالمے ہو بہو وہی منظر پیش کرتے ہیں جو پردہ سیمیں پر کسی فلم کو دیکھنے سے آنکھوں کے سامنے لہراتا ہے۔
ان کے ہاں ایک بھرپور اور واضح خیال بڑے ربط ضبط اور سیج دھج کے ساتھ افسانوی تانا بانا بنتا رہتا ہے اور پھر وہی خیال نہایت سحر کارانہ رعنائی

اور جامعیت کے ساتھ افسانے سے منتقل ہو کر قاری کے ذہن پر اپنے ابریشمی اور سنہری پنکھ پھیلا دیتا ہے

بلاشبہ انہوں نے ان کہانیوں میں اپنے مشاہدات کی مشعل سے انسانی زندگی کے کسی اہم اور تاریک گوشوں پر روشنی ڈال کر قابلِ قدر سماجی خدمت سرانجام دی ہے۔ ان کی کہانیاں ہماری موجودہ زندگی کے ریگستان میں ایسے سائبان ہیں جن کی گھنی اور خنک چھاؤں میں آبدیدہ اور دکھی انسانیت تازہ دم ہوتی ہے اور زندگی کے خندہ بلب اور تابناک تصورات کی طرف بڑی حوصلہ مندی اور پامردی سے آگے بڑھنے کی خواہش اس کے سینے میں منہ بند کلیوں کی طرح چٹکنے لگتی ہے۔

انسانیت پر ان کا یہ کامل اور پختہ اعتماد کسی حادثے یا اتفاق کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ ہی کسی جذباتی یا خیالی فیصلے کا فوری ردِ عمل ہے بلکہ ان کی مسلسل اور متواتر ذہنی تپسیّا کا حاصل ہے اور اس مقام تک پہنچنے کے لئے ان کے دماغ کو انسانی تاریخ اور انسانی تمدّن کے ایک گہرے اور طویل مطالعہ کی گھاٹیوں سے گزرنا پڑا ہے

ان خصوصیات کی موجودگی میں بھی ان کی یہ شخصی خوبی زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ وہ اپنی افسانہ نگاری کے بارے میں زیادہ خوش فہم نہیں ہیں۔ اپنی فنی تخلیقات کے بارے میں انہوں نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ میں نے جتنی اچھی چیزیں پڑھی ہیں۔ کاش اتنی اچھی چیزیں لکھی بھی ہوتیں

تاہم ان کی آج کی کہانیوں اور ابتدائی کہانیوں میں نمایاں فرق ہے۔ ان کی کل کی کہانی کسی چنچل لڑکی کی طرح شوخ بھولی بھالی اور معصوم تھی۔ اور آج کی کہانی میں وہ

لڑکی انسانیت دیوی کے روپ میں نظر آتی ہے اور ظاہر ہے کہ آج کی انسانیت کا انگ انگ آج کے نظام میں زخم زخم بنا ہوا ہے اور انہیں زخموں کی تپک ان کی تازہ کہانیوں میں بھی محسوس ہوتی ہے مگر یہ تپک اور یہ سڑاند نیائے شرما کی نہیں موجودہ سماج کی دین ہے۔

نیائے شرما کی پہلی کہانی کا خالق ایک شریر کھلنڈرا ضدی اور لاڈلا طالب علم تھا جس کے ذہن میں کچی کلیوں کی باس تھی اور قوسِ قزح کے جھلملاتے ہوئے رنگوں کی راگنیاں گنگناتی تھیں اور جس کے نزدیک زندگی خود بھی منشی پریم چند کے خیالوں کی طرح پاکیزہ بے لوث اور حسین تھی۔ مگر اس کی آج کی کہانی کا مصنف ایک آزمودہ کار اور جہاندیدہ انسان ہے۔ جس کے دماغ کی پیشانی پر زندگی کے عجیب و غریب تجربوں اور زمانے کے حیرت انگیز نشیب و فراز کے خطوط مرتسم ہیں جو انسان کی مجبوریوں اور گندگیوں کے ساتھ ساتھ اس کی لازوال عظمتوں کا بھی پورا پورا شعور رکھتا ہے۔

نریش کمار شاد

ہار جیت

گھر سے کلب تک کلب سے سماج تک اور سماج سے دور دور تک ——

اس کا نام ہنسا مشہور ہو چکا تھا۔ دیوندر اکثر سوچا کرتا تھا کہ کرونا جب اس سے نفرت کرتی ہے اور آج تک اس نے کبھی اس سے سیدھے منہ بات نہیں کی تو اس کے دیئے ہوئے نام کو اس نے کیونکر اپنا لیا۔ تخلیہ میں کہا اور دو آدمیوں کے سامنے کہا۔ جب دیکھو ہنسا نے اس کا مذاق ہی اڑایا تھا۔ ہنسا کے پتا جی رائے بہادر بدری داس اس کے والد رام لال کو اپنا پڑوسی ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ تیس برس کی طویل مدت میں ایک لمحہ کے لئے بھی انھوں نے رام لال کو اس کے افلاس کے باوجود پرایا خیال نہیں کیا تھا مگر ہنسا کا دماغ ہمیشہ ہی عرشِ بریں پر رہتا تھا۔ اور اس کو اکثر احساس ہوتا تھا کہ ہنسا کی غلافی آنکھوں میں ایسے تیر و نشتر چھپے رہتے ہیں جو کسی وقت بھی اس کی خودداری کا بخیہ ادھیڑنے سے نہیں چوکتے۔

وہ ہنسا کے یہاں آتا تھا۔ خواہش نہ ہونے کے باوجود۔ وہ ارادے سے جو وہ گھنٹوں اپنے دالان میں ٹہل ٹہل کر باندھتا۔ وہ قسمیں جو اس کے سینے سے ابھرتیں، ایک دو لمحوں میں ہنسا کو دیکھنے کی تمنا کے سامنے دم توڑ جاتیں۔ اور وہ اپنی سوالی معنی نگاہیں لئے خود کو ہنسا کے

ڈرائنگ روم میں پاتا۔ وہ خوب سمجھتا تھا۔ کہ ہنسا اس کی بڑھتی ہوئی حجامت۔ بھورے رنگ کی کشمیری پٹی کے کوٹ۔ کھدر کے تنگ مہری کے ملگجے سے پاجامے اور سونی سونی نگاہوں کا مذاق اڑا رہی ہے۔ مگر نہ جانے کونسی طاقت تھی۔ جو اس کے قدم باندھ کر اس کو کوچ پر پٹک دیتی۔

ایک کھنکتی سی شام تھی۔ ہلکی ہلکی بوندیں سائبان کی سطح پر جلترنگ بجا رہی تھیں۔ اور امڈی ہوئی گھن گھور گھٹائیں ماحول کے مردنگ پر گاہے گاہے ایسی مدھر سی تھاپ دیتی تھیں کہ کلیجوں میں ہوک سی اٹھنے لگتی تھی۔ اور کسی نازک اندام رقاصہ کے دوپٹے کی نقرئی گناری کی طرح ڈرائنگ روم کے دروازے اور کھڑکیوں کے شیشوں کے پیچھے سے بجلی کی باریک باریک لہریں کوندا اٹھتی تھیں۔ اور ڈرائنگ روم کے اندر نیلے نیلے بلبوں کی روشنی ہنسا کے رخسار کی عنابی سطح پر پھسل رہی تھی۔ کشور کا ہلکے نیلے رنگ کا سوٹ نیلے صوفے میں پیوست ہو گیا تھا۔ اور دلیپ آتش دان کے قریب کھڑا آگ تاپ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں مچلتی ہوئی لپٹوں پر جمی ہوئی تھیں۔ شعلوں کے عکس نے اس کے چہرے کو اور بھی جاذب نظر بنا دیا تھا۔ اگنی دیوتا کے حسین چہرے کی طرح سُرخ و سفید۔ اور دیوندر کی سونی سونی نگاہیں سامنے کی دیوار پر لٹکی ہوئی نورما شیرر کی تصویر کو دیکھنے کے باوجود نہیں دیکھ رہی تھیں۔

ہنسا کے باریک ہونٹ تھرکے "دیوندر! تم سے کسی لڑکی نے کبھی محبت کی ہے؟"

کتنا طنز تھا اس کے ایک سوال میں لیکن دیوندر محض مسکرا دیا اور بے معنی نگاہوں سے ہنسا کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

دلیپ نے آگ تاپتے ہوئے کہا۔ "دیوندر کا حلیہ بتا رہا ہے کہ محبت کے شعلوں نے اس غریب کو بری طرح جھلس کر رکھ دیا ہے"۔

ہنسا پھر مسکرائی۔ اس کے سدا بہار رخساروں پر شادابی مچل گئی۔ کشور نے کندھوں کو خفیف سا جھٹکا دے کر تبصرہ کیا۔ "محبت کا مطلب یہ نہیں کہ انسان اپنے حلیے اور لباس کو بگاڑ کر بیٹھ جائے"۔

دلیپ نے بغیر کشور کی طرف دیکھے ہوئے کہا۔ جس کی روح کو محبت کا نکھار نصیب ہو جائے اسے حلیے اور لباس جیسی بے معنی چیزوں سے کیا لینا۔ شعلوں کی تپش کے سامنے ملمع بھی کبھی ٹھہرا کرتا ہے ———— ؟

ہنسا کے لہجہ میں تعجب تھا۔ ایسا تعجب جس میں مذاق اور طنز کے سوا کچھ نہ تھا۔

"تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں دلیپ! کہ دیویندر کی روح کا میل ان کے کپڑوں پر اتر آیا ہے"۔

کشور گویا آتش دان کی لپٹوں سے بولا "آپ تو ہنسا جی بُری طرح دیویندر کا مذاق اڑاتی رہتی ہیں۔ حالانکہ آپکو یہ نہیں بھولنا چاہیئے۔ کہ آپ کو اتنا پیارا نام دیویندر ہی نے دیا تھا"۔

ہنسا کے نقرئی قہقہے گونج اٹھے "کبھی کبھی تو آبھی تو کوئل کی بولی بولنے لگتا ہے"۔

دیویندر کے کان سُرخ ہو گئے۔ مگر وہ اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ اور اب کی بار کچھ ایسی نگاہوں سے دلیپ نے دیویندر کی طرف دیکھا جن میں ہمدردی کی بھی ہلکی سی جھلک تھی۔ وہ نہایت سنجیدگی سے ٹھہر ٹھہر کر بولا "دیویندر! تم نے ہنسا کا نام کیا سوچ کر رکھا تھا"؟

دیویندر کی نگاہیں اس وقت بھی جھکی ہی رہیں۔ جب اس نے کہا "میں نے ہنس کبھی نہیں دیکھے۔ مگر سنا ہے وہ بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔ ہمالیہ کی چوٹی کو چومنے والی برف کی طرح سفید اور ملائم۔ اور جب شفق کی دلہن مانگ میں سیندور بھر کر سرخ چلمن

کے پیچھے انگڑائی لیتی ہے تو ہنسوں کی قطاریں مال رونس کے نغمے گنگناتی موتی چگنے مانسرور کی طرف چل پڑتی ہیں۔ اور دُور بہت دور سے سورج سنہری غبار اڑا کر سفید پردوں پر پھول بوٹے بنا دیتا ہے۔ کتنے حسین ہوتے ہیں ہنس ——— "

ہیتا کی آنکھیں مخمور سی ہو کر چڑھ گئی تھیں۔ کشور ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور دلیپ شعلوں کا ناچ دیکھنے میں محو تھا۔۔

ہیتا نے آہستہ سے کہا "آج پھر دیویندر کوئل کی طرح کوک پڑا ——— "

دلیپ نے آگ کریدتے ہوئے کہا۔ "چاند کے دھوکے میں انگارے چبانے والے چکوروں کے بارے میں سنا ہے دیویندر! "

دیویندر نے جواب دیا۔ "سنا تو ہے مگر کبھی کسی نے یہ نہیں بتایا کہ کیا مر مٹنے والا چکور بھی انہیں اپنے لیئے انگارے ہی سمجھتا ہے۔"

دیویندر کی اس بات نے گویا ماحول پر ایک سکتہ سا طاری کر دیا۔

دلیپ بڑبڑایا۔ "کتنے گہرے ہو تم دیویندر! "

دیویندر سونی سونی نگاہوں سے ہیتا کی طرف دیکھنے لگا۔ کشور بول اٹھا۔ "اتنے گہرے کہ اگر کوئی ڈوب بھی جائے تو اس کی آواز تک سنائی نہ دے۔"

ہیتا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اسی لئے تو دیویندر سے مجھے کبھی کبھی ڈر سا محسوس ہوتا ہے۔"

کشور مسکرایا اور دیویندر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "یونیورسٹی کو تو ہم لوگ چاٹ چکے اور تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

دیویندر نے گویا اس سوال کی کوئی اہمیت ہی نہیں سمجھی۔ وہ پھیکی سی ہنسی ہنس

کہ بولا "میں نوکری کرونگا"

کشور نے پوچھا "کلرکی؟"

دیویندر سنجیدہ ہوگیا۔ اور بولا "کیوں کوئی حرج ہے؟"

ہنسا نے کہا "مجھے خوشی ہے دیویندر کہ تم اپنی اوقات نہیں بھولے ہو"

دیویندر نے کہا "میرے پتاجی میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ میں بھی کشور کی طرح خواب لیتا رہوں اور پھر چند سال کے بعد بھی زندگی وہیں سے شروع کروں جہاں سے پہلے چھوڑی تھی"

ہنسا نے کہا "تم اپنے دوستوں سے بہت جلتے ہو دیویندر ——— !"

اور دیویندر کی نگاہیں بھی آتش دان پر جم گئیں اور وہ بڑبڑانے لگا "جس کی زندگی کا پروانہ کسی شمع کی لو سے جل کر خاک ہو چکا ہو ——— ایسا بدنصیب پروانہ کہ جس شمع پر اس نے زندگی نثار کر دی اور اس شمع کو اس سے ڈر ہی لگتا رہا۔ ایسے بدبخت سے آہوں کی جگہ تبسّم کی امید فضول ہے"

ہنسا نے تالی بجاتے ہوئے کہا "ویل ڈن۔ کیا شاعری فرمائی ہے آپ نے"

کشور بولا "دیویندر جی ہر قدم پر اپنے محرومی پن کا ثبوت دینے سے نہیں چوکتے"

دلیپ نے اپنی بھاری آواز میں کہا "تم یہاں کیوں آیا کرتے ہو دیویندر!"

دیویندر اب تک چڑ سا گیا تھا۔ بولا "میں آپ کے گھر تو نہیں آتا دلیپ کمار جی"

بوندا باندی تیز ہو گئی تھی۔ سائبان پر جلترنگ کی بے دردی ہو گئی۔

دیویندر اٹھتے ہوئے بولا "اب میں جاؤں گا"

کشور نے کہا "بارش تیز ہو گئی ہے ذرا ٹھہرو"

ہنسا بولی "یہ ان کی کونسی برساتی بھیگ جائے گی"۔

دیویندر اٹھ کر چلا گیا اور دلیپ کمار برساتی اور چھتری اٹھا کر پیچھے پیچھے چل دیا۔
بوچھاڑ بہت تیز تھی۔ دیویندر بُری طرح بھیگ رہا تھا۔ دلیپ نے آہستہ سے پوچھا۔ "کیا
بات ہے دیویندر! آج بہت چڑھے ہوئے ہو؟"

دیویندر نے کہا "جُوں جُوں بارش تیز ہوتی جا رہی ہے دل میں شعلے بھڑکتے جا رہے
ہیں دلیپ!"

دلیپ نے پُوچھا "کیوں کسی نے جذبات کے سیلاب پر بند باندھ دینا چاہا ہے"
دیویندر دلیپ کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اور پھر دھیرے دھیرے بولا۔
"تم دلوں کا حال کیونکر جان لیتے ہو دلیپ!"

دلیپ ماتھے سے پانی پونچھتے ہوئے بولا "تمہارا دل اور اس دل کی دھڑکنیں
سینے میں کہاں چھپی ہوتی ہیں۔ وہ تو اچھل اچھل کر چہرے پر آگئی ہیں"
دیویندر نے کہا۔ "سچ"

دلیپ بولا "اور جانتے ہو یہ فتح نہیں شکست ہے۔ ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ
جائے تو محبت بدنام ہو کر دم توڑ دیتی ہے۔ یہ ایسی شراب ہے جس کی پاس آنکھوں سے
سُرخی بن کر اُبلتی ہے"

دیویندر خاموش رہا۔ اور دلیپ پھر بولا "آج پتا جی نے پہلی بار مجھے ہنسا کے
یہاں جانے سے منع کیا ہے اور آج میں نے پہلی دفعہ ہنسا کے یہاں جا کر پتا جی کی بات
کو کاٹا ہے"

دلیپ نے پوچھا "تو ــــــ"

دیویندر نے جواب دیا " آج اتنے بڑے لاہور شہر میں کوئی اپنا دکھائی نہیں پڑ رہا ہے۔ سینے میں عجیب گھٹن سی محسوس ہوتی ہے۔ میں جانتا ہوں ہمسا مجھ سے کبھی محبت نہیں کرے گی۔ اور نہ ہی اسے مجھ ایسے ادنےٰ انسان سے محبت کرنی چاہئے۔ مگر میری تمنّا تو صرف اتنی ہے کہ میں ہمسا کو دن میں ایک دفعہ دیکھ لوں ——— چاہے وہ مجھ سے محبت کرے یا نہ کرے۔ خواہ مجھ سے ہنس کر بولے یا میرا مذاق اڑائے

دلیپ نہایت سنجیدگی سے بولا " تم مجھ سے یہ بات کیوں کہہ رہے ہو۔ ممکن ہے مجھے بھی ہمسا سے محبت ہو ——— "

دیویندر مسکراتے ہوئے بولا " یہ میں خوب جانتا ہوں۔ تم اس سے محبت کرتے ہو۔ کشور اس سے محبت کرتا ہے اور جو بھی اس کے قریب آئے گا وہ اس سے محبت کریگا۔ مگر دلیپ! میری محبت اتنی کمینی نہیں کہ میں تمہیں اپنا رقیب سمجھوں۔ میں تو تمہیں اور کشور کو اپنا ہم راہی سمجھتا ہوں "

دلیپ نے پوچھا " یہ راہ تمہیں کہاں لے جائے گی ؟ "

دیویندر بولا " محبت کی اس ان دیکھی دنیا میں جس کا تصور روح کو جِلا بخشتا ہے اور وہاں پہنچ کر تو روح نہ جانے کیا سے کیا ہو جاتی ہے "

دیویندر کا گھر آ گیا تھا۔ اور وہ دبے پاؤں اپنے صحن میں داخل ہو گیا۔

لاہور سے امرت سر جانے والی سڑک پر ہمسا اپنی نئی کار میں کشور کے ساتھ گویا سفید سمینٹ کی سڑک پر تیرتی جا رہی تھی۔

اور دوسری کار میں دیویندر اور دلیپ پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ ہمسا کار کی رفتار

آہستہ آہستہ بڑھا رہی تھی اور ادھر ہنسا کا ساتھ دینے کے لیے دلیپ کو بھی رفتار تیز کرنی پڑ رہی تھی۔ وہ سٹیرنگ کو مضبوطی سے دباتے ہوتے بولا: "بہت تیز جا رہی ہے ہنسا!"

دیویندر کے خیالات کو خفیف سا جھٹکا لگا۔ مگر وہ خاموش ہی رہا۔

دلیپ نے پوچھا "کیا سوچ رہے ہو دیویندر!"

دیویندر نے چونکتے ہوئے پوچھا "کہاں جا رہے ہیں ہم لوگ ——— ؟"

دلیپ نے کہا "جہاں ہنسا جا رہی ہے۔"

دیویندر نے پوچھا "ہنسا کہاں جا رہی ہے ؟"

"جہاں اس کی اُمنگیں لے جائیں" دلیپ نے جواب دیا۔

دیویندر نے پھر کہا "ہنسا کی اڑان ان تھک ہوتی ہے دلیپ !"

دلیپ نے کہا۔ "جہاں تک جان ساتھ رہے گی ہنسا کا ساتھ تو دینا ہی ہے۔"

دیویندر نے کہا "تمہیں جان کا احساس تو ہے۔"

دلیپ نے پوچھا "اور تمہیں ———"

"یہاں تو جان بھی اپنی نہیں معلوم ہوتا ہے وہ بھی ہنسا کی امانت ہے ———" دیویندر نے جواب دیا۔

ہنسا نے پوچھا "کشور! کہاں تک جاؤ گے ؟"

کشور نے کہا "جہاں تک مرضی ہو چلو۔"

ہنسا نے مسکراتے ہوئے کہا "پیچھے والے گالیاں دیں گے۔"

کشور بولا۔ "سامنے تو راستہ صاف ہے۔"

ہنسل نے کہا۔"کبھی کبھی پیچھے والے بھی پیچھے کھینچ لیا کرتے ہیں"۔

کشور بولا "ہاں اگر آگے والے لڑکھڑا جائیں"۔

ہنسا ہنستے ہوئے بولی "صرف طاقت ہی نہیں۔ التجائیں بھی دوسرے انسان کو لڑکھڑا دیتی ہیں"۔

کشور نے کہا "بڑھنے والے پیچھے رہ جانے والوں کی التجائیں نہیں سنا کرتے"۔

ہنسل نے ہارن دیتے ہوئے کہا۔ "التجائیں اپنا اثر قبول کروا ہی لیتی ہیں"۔

کشور بول اٹھا۔ "اور اگر پیچھے رہ جانے والے آگے بڑھ جائیں"۔

ہنسل نے کہا۔ "اگر وہ اپنے نہیں تو پھر بھی فتح اپنی ہی ہے"۔

کشور نے کہا۔ "ہنسا! دلیپ کو آگے جانے دو۔ گاڑی آہستہ کر لو"۔

ہنسا نے ایکسلریٹر سے پاؤں اٹھاتے ہوئے دلیپ کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

کچھ دور دونوں گاڑیاں برابر چلیں اور پھر اچانک ہنسا کی چیخ نکل گئی۔

یک لخت موڑ آ گیا تھا۔ دلیپ نے ہنسا کا راستہ صاف رکھنے کے لئے اپنی گاڑی گڑھے میں ڈال دی۔ اس کی گاڑی قطعی الٹ گئی۔

ہنسا نے کچھ فاصلے پر گاڑی روک لی۔ اور کشور گاڑی سے اترتا ہوا بولا "فتح اپنی ہے پیچھے والوں نے ثابت کر دیا کہ وہ اپنے تھے"۔

اور دیویندر زخمی دلیپ سے کہہ رہا تھا "سچ مچ دلیپ! جہاں تک تمہاری جان نے ساتھ دیا۔ تم نے ہنسا کا ساتھ دیا"۔

سب لوگ لاہور لوٹے مرجھائے ہوئے چہرے لے کر۔ مگر دیویندر سنجیدہ تھا۔ راہ میں زخمی دلیپ سے محض اتنا بولا "اس جیت میں تھوڑا سا حصہ دے دیتے دلیپ"۔

ہمنا کا چہرہ سرخ ہو گیا - وہ بولی "کتنے بے وقوف ہو تم دیویندر! اس وقت بھی تمہیں شاعری سوجھ رہی ہے"۔

دلیپ - دیویندر اور کشور کا تو دن کر گیا - رائے بہادر بدری داس کے یہاں تمام محلہ اکٹھا ہو رہا تھا - رات کو کرشن نگر کو مذہب کے محافظوں نے جلا کر خاک کر دیا تھا - مادرِ وطن کے سپوتوں نے وطن کی بیٹیوں کی عصمت سے ہولی کھیلی تھی - سڑک پر پڑی ہوئی لاشیں مذہبی نعروں کا مذاق اڑا رہی تھیں - اس بوڑھیا کو ہمنا تسلی دے رہی تھی جس کا لڑکا کل شام کرفیو کھلتے ہی بازار سے کھانا لینے گیا تھا۔

بوڑھیا کہہ رہی تھی "ضرور راجو کسی کے مکان پر ٹھہر گیا ہے - بھگت سائیں داس کی آشیرباد سے پیدا ہونے والا لڑکا فسادیوں کے ہاتھ سے نہیں مر سکتا ہے"۔

ہمنا کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ناچ اٹھی -

بوڑھیا بولی "ہوگا کرفیو - میں اسے ڈھونڈنے جاتی ہوں"۔

ہمنا نے جواب دیا "کرفیو کھلنے میں صرف پندرہ منٹ ہیں"۔

کرفیو کے کھلتے ہی بوڑھیا باہر کو دوڑی - اور ہمنا کے چہرے پر مایوسی کا سایہ پڑ گیا - دیویندر بوڑھیا کے پیچھے پیچھے چل پڑا - موڑ پر راجو کی لاش پڑی تھی - سڑک پر بکھرے ہوئے کھانے کو کتے کھا رہے تھے - بوڑھیا کا دماغ چکرا گیا - وہ اس بھگت سائیں داس کو پکارنے لگی جس کی اپنی لاش رام گلی میں تین دن سے سڑ رہی تھی - اور دیویندر ابھی پہنچا ہی تھا کہ ایک خنجر چمکا اور بوڑھیا اپنے بیٹے کی آغوش میں جا گری -

دیویندر گھر واپس آگیا اور گھر لوٹتے ہی اس نے دیکھا کہ رائے صاحب کا سامان

سڑک پر لادا جا رہا ہے اور دلیپ اور کشور ہنسا کے ساتھ کار میں بیٹھ چکے ہیں۔ ٹرک اور کار میں اور جگہ نہیں تھی۔

دلیپ نے کہا۔ "دیوبیندر"!

اور دیوبیندر کی آنکھوں کے سامنے راجو کی لاش۔ بکھرا ہوا کھانا اور بڑھیا کی تصویریں گھوم رہی تھیں۔

دیوبیندر بولا "جلدی نکل جاؤ ہنسا اس جہنم سے۔ یہاں مذہبی جنون زور پکڑ چکا ہے"!

کار چلی گئی۔ دیوبیندر خاموش کھڑا رہا۔ اور اس کے پتا کہہ رہے تھے "امیر کسی کے دوست نہیں ہوتے ______"

ابھی چند گھنٹے ہی گزرے تھے کہ دلیپ نے آکر بتایا کہ لٹیرے بہادر اور ان کا کُل خاندان قتل کر دیا گیا ہے اور مجھے فسادیوں نے اپنا ہم مذہب سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔ کشور نہ جانے کہاں موٹر لے بھاگا ہے اور ہنسا کو فسادی مغلپورہ کے پاس کسی گاؤں میں لے گئے ہیں۔

دیوبیندر پتھر کا بُت بنا کھڑا تھا۔

سوکھے ہوئے جوہڑ کے کنارے جہاں چار پیپل ایک دوسرے سے گُتھتے ہوئے کھڑے تھے ایک تازہ مسمار شدہ مندر کے صحن میں ہنسا۔ دلیپ اور دیوبیندر بیٹھے تھے لباس کی تبدیلی نے دلیپ اور دیوبیندر کے مذہب کا بھی حلیہ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ ہنسا بالکل خاموش اور بے جان مورتی بنی بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں جذبات برف کے

تودوں کی طرح سرد ہو چکے تھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے رخساروں نے کبھی پوڈر کی شکل ہی نہیں دیکھی۔ کھدر کی سبز سلوار اور جمپر میں وہ کوئی میراثن معلوم ہو رہی تھی۔

وہ دھیرے دھیرے بڑبڑائی "تم لوگوں کو میرا پتہ کیسے چلا؟"

دلیپ بولا "اسے ابھی چھوڑو پہلے یہ بتاؤ تم کیسی ہو"۔

ہنسا نے کہا "دیکھ تو رہے ہو زندہ ہوں"۔

دیویندر بولا "جس کو بھگوان نے بڑی مشکلوں سے بنایا ہو اس کو ختم کرنے کی طاقت شیطان کے ہاتھ میں نہیں ہے"۔

ہنسا نے کہا۔ "دیویندر! تمہاری شاعری اب بھی زندہ ہے"۔

دلیپ بولا "اگر شاعری کا مطلب جذبات کا سلیقہ ہے اور جذبات اگر بہاروں کی گود میں ناچتے ہیں تو شعلوں کے جھرمٹوں میں بھی جھول سکتے ہیں"۔

ہنسا نے دلیپ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "تم بھی شاعری کرنے لگے کیا؟"

دیویندر بولا۔ "دلیپ کی زندگی میں کیا خزاں نہیں آئی؟"

ہنسا خاموش ہو گئی۔ اور پھر بولی "مغلپورہ کے پاس ان درندوں نے ہمارا ٹرک اور کار روک لی۔ انہوں نے ———— دلیپ تمہیں معلوم ہی ہے ———— مجھے الگ کھڑا کر دیا تھا اور پتاجی۔ بھیا اور ماتاجی کو قتل کر دیا تھا۔ اور تم کس صفائی سے ان کے ہم مذہب بن کر بچ گئے تھے۔ اور کشور موقع پا کر کار نہ جانے کہاں بھگا لے گیا تھا۔ دن بھر انہوں نے مجھے ایک کوٹھڑی میں بند رکھا اور رات کو ان وحشیوں کے پانچ سرداروں نے ماتاجی اور پتاجی کی یاد اور اس پیار کی نلحیوں کو کالے کفن سے ڈھک دیا۔ میں چیخی اتنا چیخی کہ قوت گویائی سلب ہو گئی۔ اور پھر مجھے کچھ بھی ہوش نہیں رہا۔

جب آنکھ کھلی تو اس وقت شیر دل پٹھان کے مکان میں خود کو موجود پایا۔ اب میرا نام ریحانہ رکھ دیا گیا ہے اور اب جلتے ہوئے پیانو بجانے کی جگہ میں چکی پیستی ہوں۔ اب میں کار ڈرائیو کرنے کی بجائے کھیتوں میں بکریاں چراتی ہوں۔ اور ہر رات میرا بستر گاؤں کے ایک گھر سے دوسرے گھر میں لگا دیا جاتا ہے۔ تاکہ مغویہ عورتوں کی تلاش کرنے والے ہندوستان کے سپاہی مجھے ہندوستان نہ لے جائیں"۔

دلیپ بولا" ہم لوگ جالندھر کے شیخ بن کر دو مہینے سے تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ آخر پتہ چل ہی گیا"۔

دیویندر نے پوچھا۔" اب ہندوستان چلو گی"؟

ھنسا بولی"۔ کون لے جائیگا مجھے"۔

دلیپ بولا" میں ہندوستانی سپاہی لاؤں گا اور شیخ دیویندر اسی گاؤں میں رہے گا"۔

ھنسا نے کہا" بہت چالاک ہیں یہ لوگ۔ دیویندر سے بھی زیادہ چالاک"۔

دلیپ نے کہا" تم دونوں پرسوں شام اس مندر میں آ چھپنا"۔

ھنسا بڑبڑائی۔" یہ سب کچھ ہو کیا گیا۔ کیا انسان میں بھی اس قدر درندگی بیدار ہو سکتی ہے"؟

دلیپ بولا۔" پانی میں لاٹھی مارنے سے چھینٹے تو اڑتے ہی ہیں۔ ہندو اور مسلمان پانی کی طرح ایک ہو کر زندگی کے دھاروں میں بہہ رہے تھے۔ دو قوموں کے حامیوں کی خود غرضی جاگی اور پھر خون کے چھینٹے بکھر گئے"۔

دلیپ اتنا کہتے کہتے اٹھ کر چل دیا۔ وہ جاتا ہوا بولا" میری بات نہ بھولنا دیویندر"!

پرسوں نہیں بلنا۔"

ٹوٹے ہوئے مندر کے صحن میں دیویندر اور ہنسا چھپے بیٹھے تھے۔ ان کے دلوں کی دھڑکنیں گویا اچھل کر جھروکوں سے باہر نکل جانا چاہتی تھیں اور دور سے رینگتی ہوئی گاؤں تک آنے والی سڑک پر بھینس بھی ٹرک کا دھوکا دے جاتی تھی

ہنسا نے کہا۔ "دیویندر! تمام گاؤں مجھے ڈھونڈ رہا ہوگا۔"

دیویندر خاموش تھا۔

ہنسا نے پوچھا۔ "دیویندر! بولتے کیوں نہیں"؟

دیویندر اس بار بولا۔ "دلیپ ضرور آئے گا۔"

ہنسا نے کہا۔ "میرے دل میں وہم کیوں اٹھ رہے ہیں"؟

دیویندر خاموش رہا۔

ہنسا نے جھروکوں میں سے جھانکتے ہوئے کہا۔ "کچھ لوگ ہمیں ڈھونڈنے ادھر آ رہے ہیں"۔

دیویندر نے ہنسا کو اندھیرے کونے میں دھکیل دیا۔

قدموں کی چاپ مندر کے صحن میں بھی سنائی دے رہی تھی۔

قدم بالکل نزدیک آ گئے تھے۔

دیویندر بولا۔ "کیا مذاق ہے پاخانہ بھی نہیں بیٹھنے دیتے۔"

باہر سے قہقہوں کی آواز آئی۔ "بہت نیک جگہ تلاش کی مرے یار"۔

دیویندر بولا۔ "خدا کی قسم جب سے یہاں حاجت رفع کرتا ہوں پیٹ ٹھیک رہنے لگا ہے"۔

باہر سے آواز آئی۔ "بیٹھے رہو بھیا! ہم نور ریحانہ کی تلاش کر رہے ہیں۔ نہ جانے کہاں چلی گئی ہے؟"

دیویندر بولا۔ "ارے کہیں بھاگ تو نہیں گئی؟"

باہر سے آواز آئی۔ "ہمیں بھی یہی شک ہے"!

قدموں کی چاپ مدھم پڑتے پڑتے دور بہت دور چلی گئی تھی۔

کافی اندھیرا ہو گیا تھا ——— دور کہیں موٹر کی گونج سنائی دی۔

ہنسا کے کہنے پر دیویندر مندر سے باہر آیا۔ اور کچھ دیر بعد گولی چلنے کی آواز آئی۔ دیویندر ایک دم مندر میں واپس لوٹ آیا۔

ہنسا بولی۔ "یہ گولی کس نے چلائی ہے؟"

دیویندر نے کہا۔ "شاید وہ پٹھان یہیں کہیں بیٹھا ہے؟"

ہنسا نے کہا "میں تو ڈر گئی تھی"۔

دیویندر بولا "اسی لیے میں فوراً واپس لوٹ آیا"۔

ہنسا نے کہا "میں سمجھی کہ تم ——"

دیویندر بولا "میرے گولی لگتی۔ تو واپس کیونکر لوٹتا"۔

اور دو موٹریں مندر کے قریب آ پہنچیں۔ ہندوستانی سپاہی موٹر سے نیچے اتر آئے۔ دلیپ چلایا "آجاؤ ہنسا"!

ہنسا اور دیویندر ٹرک میں آبیٹھے۔

ٹرک چل دیئے۔

ہنسا نے اگلی سیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ارے یہ تو کشور ہے"!

دلیپ نے کہا۔ "ہاں اگر کشور مجھے نہ ملتے تو شاید میں ملٹری کا بندوبست نہ کر پاتا"۔

ہنسا نے پوچھا۔ "کشور! میں آگئی ہوں۔ تم اتنے چپ چپ کیوں ہو"؟

کشور نے جواب دیا۔ "زندگی میں اتنی قلابازیاں کھائی ہیں کہ دماغ سرد ہو کر رہ گیا ہے"۔

دیوبندر نے کہا۔ "کشور! تمہاری آرزوئیں جس طرح پوری ہوئی ہیں بھگوان کرے سب کی ہوں۔ سو اتنی خوشی تو سرد سے سرد دماغ کو بھی گرم کر دے گی"۔

کشور بڑبڑایا۔ "میں سوچ رہا ہوں دلیپ! کہ ماں باپ مجھے ہنسا کو اپنانے نہیں دینگے"۔

دیوبندر چلایا۔ "کیا کہہ رہے ہو کشور! کیا سچ مچ عشق بھی خود غرض بن سکتا ہے"؟

کشور بولا۔ "اتنے بیکسوں کا خون بھی سماج کے فولادی قانونوں کو اس کے ٹھیکے دار دل کے دماغ سے نہیں دھو سکا ہے"۔

دیوبندر بولا۔ "تو کیوں نہیں بغاوت کر دیتے ایسے سماج سے۔ پھر پھونک دو ایسے سماج کو۔ ایسے سماج کو اس کی نفرت کے جہنم ہی میں جھونک دو"۔

کشور نے کہا۔ "تم تو بے وقوف ہو"۔

دیوبندر بولا۔ "اچھا میں چپ ہو جاتا ہوں"۔ اور پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بڑبڑایا۔ "کیا تم بھی ہنسا کو نہیں اپناؤگے دلیپ"؟

دلیپ نے جواب دیا۔ "میں ہنسا کو اس کی مرضی کے خلاف کیونکر اپنا سکتا ہوں"۔

ہنسا بولی۔ "مجھے نہیں آتا رونا"۔

دلیپ نے کہا۔ "ایک بزدل کی شکست نے کیا تمہیں بھی بزدل بنا دیا ہے"؟

ہنسا خاموش رہی۔ اور دیوبندر کہنے لگا۔ "ہنسا! دلیپ کے جذبات کی قدر کرو۔ اس نے دہکتے ہوئے جہنم میں بھی تمہارے پریم کو زندہ رکھا ہے"۔

ہنسا بڑبڑائی۔ "مجھے احساس ہو رہا ہے دیوبندر! تم بے وقوف نہیں ہو میں بھی

راہ بھول گئی تھی"۔

دلیپ بولا "تو اب کس سماج میں طاقت ہے جو تمہیں مجھ سے جدا کر سکے"!

دیویندر بولا "سچ مچ تم دیوتا ہو دلیپ! واقعی تم نے ہنسا کا ساتھ دیا ہے"!

دلیپ بولا "مگر تمہارے جذبات مجھے معاف کر سکیں گے"!

دیویندر نے کہا "تم نے تو بھیّا میرے جذبات کی لاج رکھ لی ہے"!

سب خاموش ہو گئے۔ اور تین گھنٹوں کے بعد مظلوموں کا یہ قافلہ ہندوستان میں داخل ہو گیا۔ دلیپ نے جے ہند کا نعرہ لگایا۔ اور سب لوگ ٹرک سے اتر آئے۔ مگر دیویندر ٹرک ہی میں رہ گیا۔ مندر کے پاس لگی ہوئی گولی نے اپنا اثر آہستہ آہستہ پورا کر دیا تھا۔

دلیپ بڑبڑایا "تو یہ تھی تمہارے جذبات کی لاج۔ دیویندر! اپنی اس جیت میں تھوڑا سا حصہ مجھے بھی دے دیتے ———"

شکست اندر شکست

آج اس کی شخصیت ہزاروں نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔۔ اس کے نغموں کے سیلاب میں بہہ جانے کے لئے آج کتنے ہی دل بے چین تھے۔ اب تک موتی لال ہال میں بڑی بڑی ہستیاں آ چکی تھیں۔ اسی منبر پر جس پر آج اسے اپنے سامعین کے سامنے اپنے فن کو پیش کرنا تھا۔ بڑے بڑے خطیب وقتاً فوقتاً اپنے تلخ و ترش خطبوں سے زمین و آسمان کے قلابے ملا کر چلے جاتے رہے تھے۔ مگر آج جتنی تعداد میں شائقین کبھی جمع نہیں ہوئے تھے۔ شہر کی خوب صورت تیتریاں اپنے جاذب توجہ لباسوں میں سج دھج کر محض اسی کی ستار کے نغموں سے لطف اندوز ہونے کے لئے کھنچی چلی آئی تھیں۔ کالجوں کے طلبا کی ایک کثیر تعداد محض اس کے فن کا مشاہدہ کرنے آئی تھی۔۔ ورنہ اس میوزک کانفرنس کے اس رات والے ایجنڈے میں تو اور کوئی ایسی کشش نہ تھی۔ کتنی بانسریاں بجیں۔ کتنے ہی وائلنوں نے راگنیوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کیں۔ کتنے ہی راگ فضا میں لہرائے۔ ان مختلف مرصع جھنکاروں میں فن کے جداجدا رنگ روپ اجاگر تھے۔ مگر ان میں جاذبیت نہ تھی۔ ان میں دلوں کو کھینچ لینے والا لوچ نہیں تھا۔ اس وسیع ہال میں دس ہزار سے زیادہ انسان ان فن کاروں سے متاثر ہونے کی بجائے اس کے ستار کے تاروں سے ابلتی ہوئی چنچل راگنیوں سے مسحور ہونے آئے تھے

قریب قریب سبھی کو معلوم تھا۔ کہ آج سے دس برس پہلے بھی جب رمن کے فن نے پیغمبری کا درجہ حاصل نہیں کیا تھا۔ بڑے بڑے ستار بجانے والے اس کے سامنے آتے تھے۔ اور دو زانو ہو کر چلے جاتے۔ دس سال پہلے ہی اس کے نغموں میں فن کی پختگی تھی۔ اس کی جھنکاروں میں کشش کا جادو تھا۔ اس کے الاپوں میں سحر کی انگڑائیاں تھیں۔

اور پھر آج پورے دس سال ہونے کو آئے۔ اس رات ایسی ہی ایک کانفرنس میں رمن نے مسحور سامعین کو یہ کہہ کر حیرت میں ڈال دیا تھا۔ کہ کسی ذاتی معاملہ کی بنا پر آج میں نے عہد کر لیا ہے کہ دس برس تک کسی کو بھی ستار نہیں سناؤں گا ــــــ

اور اس رات کے بعد اسے کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ وہ اپنی ستار اور اپنی ستار کی سرمدی جھنکاروں کو لے کر سرمئی سایوں میں نہ جانے کہاں گم ہو گیا تھا۔

چند لوگوں کا کہنا تھا۔ کہ دور کہساروں کے آغوش میں اس نیلی ندی کے کنارے ایک پوشیدہ سی جھونپڑی میں اکیلا بیٹھا وہ پہروں ستار کے نغموں سے کھیلتا رہتا ہے۔ اور اگر کوئی بھولا بھٹکا راہی اچانک وہاں پہنچ جاتا ہے۔ تو وہ لہراتی ہوئی جھنکاروں کو سمیٹ کر ستار الگ رکھ دیتا ہے۔ اس کے دو ایک دوستوں کا کہنا تھا کہ انہوں نے چھپ کر اس کی رنگینیوں کو لہراتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور اب دس سال کی طویل مدت میں سخت ریاضت نے اس کے فن کو پیغمبری کا معراج عطا کر دیا ہے۔ اور آج اس پیغمبری کی کرامات کا مشاہدہ کرنے کے لئے لوگ کتنے بے چین تھے۔ رکی رکی سانسیں اور دھڑکتے ہوئے دل اس کے منتظر تھے

اور رمن ــــــ ــــــ ــــــ؟

وہ گرین روم کے ایک کونے میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ آج سے ٹھیک دس برس پہلے وہ مقامی میوزک کالج میں ستار کا پروفیسر تھا۔ جب کملا کلاس میں آتی تو فضا میں نشے تیرنے لگتے۔ ماحول میں رنگینیاں بکھر جاتیں۔ طلبائے موسیقی کے مختلف سازوں

کے بے مزہ نغموں میں ایک ربط سا پیدا ہو جاتا۔ اس کے کلاس میں داخل ہونے کا ایک اپنا ہی انداز تھا۔ ہلکے پھلکے ستار کو زانو پر رکھ کر بیٹھنے میں ایک اس کی اپنی ہی طرز تھی۔ بانگیشری جیسی۔ وہ بھورے بالوں والی نازک اندام لڑکی دنیا بھر کی رنگینیوں کو اپنے ساتھ سمیٹ کر لاتی تھی۔ اور مال کونس کی پر درد ہوک چھوڑ کر چلی جاتی تھی۔ اس کے الفاظ جے جے ونتی اور گن کلی کے میٹھے میٹھے سحر انگیز نغموں میں تحلیل ہو کر اس کے لعلیں ہونٹوں پر جس وقت مچلتے تو گویا برج اور الست کی مستیاں لوٹ پوٹ ہونے لگتیں۔ وہ بڑی بڑی آنکھوں والی سبک مزاج کملا سراپا سنگیت تھی

وہ اس کو دیکھتا اور تخیلات کی دنیا میں گم ہو جاتا۔ اس کا تصوّر مستقبل کی دھندلی سطح پر رنگین سپنوں کے دلکش خطوط کھینچنے میں محو ہو جاتا۔ اور پھر یہ خطوط سکڑتے سمٹتے ایک ملگجی سا نقطہ بن کر رہ جاتے۔ دلفریب خوابوں کی پژمردہ ناک سے تلخ حقیقتوں کی چنگاریاں پھوٹنے لگتیں، اور تصوّر کی آنکھ چندھیا کر رہ جاتی

کلاس میں اکثر ایک بے بنیاد سی آرزو اس کے دل میں کروٹیں لیا کرتی۔ اور وہ سوچتا کاش ان باقی کی بھدّی بھدّی لڑکیوں کو ایک دم پلیگ ہو جاتے اور وہ حسین کملا ہی کو اپنا فن دے سکے۔ وہ شیاما کالی چڑیل۔ اس بدتمیز کو کس نے مشورہ دے دیا ستار سیکھنے کا۔ اور وہ کامنی دلوی جس میں سوائے دماغ کے ہر علاقہ پر خدا کا فضل ہے۔ تین مہینے سے سرگم تک یاد نہ ہو سکی۔ بڑے سے تونبے والی ستار کو گود میں رکھ کر جب موٹی موٹی انگلیاں تاروں میں الجھاتی ہے تو روسی سرکس کا وہ سین یاد آنے لگتا ہے جس میں خرگوش کا بچہ گینڈے کی گود میں بیٹھا دم ہلایا کرتا ہے۔ اوہ خدایا! ادھر دیکھیے۔ آپ ہیں مس چندر لیکھا۔ بھویں ایک سرے سے غائب۔ نیچے کا ہونٹ شاید بہار کے بھونچال میں مجروح ہو گیا تھا۔ جواب تک بغیر سہارے کے سائبان کی طرح ایک طرف کو لٹک رہا ہے۔ جلد کا رنگ آبنوسی اور حسنِ انتخاب کالی ساری اور اس پر طرّہ یہ

کہ جال میں آپ اٹھکیلیاں پیدا کرنے کی کوشش فرماتی رہتی ہیں اور اس وقت دیکھنے والی آنکھوں کو وہی سکون ملتا ہوگا۔ جو منڈیر پر تیتر کو پھدکتے دیکھ کر ملا کرتا ہے۔ جی ہاں! آپ بھی اساوری اور بھیرویں سے متاثر ہو گئی ہیں۔

اور وہ سوچتا قسم خدا کی اس موہنی کو کم از کم اس زندگی میں تو ستار نہیں آسکتی آگے کی خدا جانے۔ تمام بدن سلائی کی طرح دبلا۔ رخسار الہ آبادی امرودوں کی طرح بے ڈول اور پھولے ہوئے۔ چار مہینے ہوئے بھیم پلاسی سیکھنے پیچھے پڑے ہے آپ کو مگر بخدا آپ خود بھیم پلاسی ہیں۔ چہرہ مہا بھارت کے بھیم جیسا اور باقی ماندہ جسم بنگال کے میدان پلاسی جیسا سکڑا سکڑا ویران۔

اور وہ سلیکھا۔ وہ یوں تو گیہوں رنگ کی ضرور ہے مگر لباس کے معاملہ میں باسلیقہ ہے اور ویسے بھی سمجھ دار ہے۔ ستار کا جھالا تڑے سرے میں بیٹھے لگا ہے شوخی طبیعت میں مقدار سے زیادہ ہے۔ جب کبھی وہ اسے کملا کی طرف راغب پاتی ہے تو آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرا دیتی ہے اور وہ جھینپ کے رہ جاتا ہے

ان سب لڑکیوں میں کملا گویا مختلف راگنیوں میں ایک سدا بہار بھیرویں تھی جس کے مدھر سُر ہمیشہ فضا میں لہراتے رہتے اور جس کی مٹھاس ہی تو دوسری راگنیوں کو کیف کا امرت بخشتی۔

اس کلاس روم میں جب بلاول اور آساوری کی مست جھنکاریں سکوت کے سرمئی ہیولوں میں گم ہو چکی تھیں۔ اور طلبا موسیقی کے چند جرعے پی کر اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ کملا نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا تھا۔

"پروفیسر صاحب! میرے پتا جی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہم لوگ ماڈل ٹاؤن میں رہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں آپ سے گھر پر ہی ستار سیکھ لیا کروں۔ آپ کی بڑی کرپا ہوگی۔ اگر آپ پتا جی سے مل لیں ——— اور وہ محض اتنا ہی کہہ

سکا تھا۔ میں آج شام کو آپ کے پتا جی سے ملونگا۔ اور کملا گویا بیناکی تار دل پر تیرتی ہوئی چلی گئی۔ اور وہ یہ سوچتا رہا۔ کہ کبھی ویسا دن بھی آسکے گا۔ جب کملا اسے پروفیسر صاحب کہنے کی بجائے رمن کہہ کر پکارے گی۔

اور وہ کملا کے گھر پر اسے ستار سکھانے کے لئے جانے لگا۔ حسن نغموں کے جادو کو ایک گھنٹہ تک جگاتا رہتا۔ جھنکاریں گونجتی رہتیں۔ راگنیاں لہراتی رہتیں اور وہ قریباً ہر روز اپنی کائنات اور کائنات کے ہنگاموں کو کملا کی ستار کی نذر کر کے گھر لوٹ آتا

وہ اتنا ہی سوچ پایا تھا۔ کہ اس کے دماغ نے ایک اور کروٹ لی۔ سنتیہ دیو کی شکل اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گئی۔ وہی بھرپور جسم کا تیکھے نقوش والا سنتیہ دیو۔ نالائق ہر روز نیا سے نیا سوٹ تبدیل کرتا تھا۔ شکل میں جاذبیت بھی تھی۔ سناتن دھرم کالج میں ایم اے میں تعلیم حاصل کرتا تھا۔ کملا کے پتا ڈپٹی شیام موہن لال کا خیال مستقبل قریب میں کملا کی منگنی سنتیہ دیو سے کر دینے کا تھا۔ وہ کسی پختہ فیصلے پر نہیں پہنچ سکے تھے۔ مگر سنتیہ دیو کا حوصلہ دیکھئے کہ ابھی سے کملا پر حق جتا رہا تھا۔ باتوں باتوں میں کہہ دیتا۔ مجھے تنقید رنگ کی ساڑھی بڑی اچھی لگتی ہے۔ یوننگ ان پیرس کی ہیر کریم سے بالوں میں لہریں خوب بنتی ہیں۔ اور ان باتوں کے بعد وہ منتظر رہتا کہ کملا حرف بہ حرف اس کی باتوں پر عمل پیرا بھی ہوتی ہے یا نہیں۔

بھلا نے ایک دن نالائق کو کیا خیال آیا کہ کملا کی ماتا کو ایک اچھا خاصہ لیکچر اس بات پر جھاڑ دیا۔ کہ جوان لڑکیوں کو جوان لڑکوں کے ساتھ تخلیہ میں نہیں بیٹھنا چاہئے۔ بوڑھیا نے یہ نصیحت کچھ اس طرح چمٹی کہ اگلے دن سے وہ جب تک کملا کو ستار سکھاتا رہتا۔ بوڑھیا دونوں کے پاس بیٹھی رہتی۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد بوڑھیا

اکتا گئی تھی۔ اور اسے کملا کے ساتھ پھر تخلیہ نصیب ہونے لگا تھا۔

اور پھر ایک شام کو جب سنگیت سمیلن کو اپنے فن سے مسحور کرنے کے بعد وہ ستار سکھانے کے لئے، اس کے گھر گیا تو وہ کتنی خوش تھی۔ اس کی آواز میں ایک مستانہ لرزش تھی۔ جب اس نے کہا تھا "پروفیسر صاحب! آج تو آپ نے کمال کر دیا۔"

حسن عشق پر مہربان ہو رہا تھا۔ نئی خوشی اسے سنگیت سمیلن کی پیہم تالیوں اور سیٹیوں سے بھی نہیں ملی تھی جتنی کملا کے ان چند الفاظ سے۔ وہ بولا "آپ کو میری ستار اچھی لگی"۔

کملا کے جواب میں سادگی مگر خلوص تھا "جب آپ ستار بجا رہے تھے۔ تو ہال میں خاموشی تھی۔ کالج کے شیطان لڑکوں کی سانسیں بھی معلوم ہوتا تھا کچھ دیر کے لئے بند ہو گئی ہیں"۔

اور پھر اس نے کہا تھا "کچھ دنوں کے بعد کملا تم بھی ایسی ستار بجانے لگو گی"۔

اور کملا نے مضراب کو انگلیوں میں نچاتے ہوئے کہا تھا "سچ مچ"۔

اور پھر وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی "یہ میڑھ کیا ہوتی ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا"۔

اور پھر اس نے کہا تھا۔ "تاروں کے پہلو میں دبا ہوا درد ہی میڑھ بن سکتا ہے۔ ستار کے بے جان تاروں پر اس درد کو اجاگر کرنے کے لئے فن کار کے اپنے دل میں بھی درد ہونا چاہیئے۔

وہ اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ اس نے دیکھا کملا کا چہرہ یک دم سرخ ہو گیا ہے جب کہ وہ سوچ ہی رہا تھا۔ کہ اس نے کملا سے اتنی بڑی بات کیونکر کہی ہے۔ بسنتیدیو نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"آج کل بڑے نام ہو رہے ہیں پروفیسر صاحب!"

اس نے انکساری برتی تھی۔ "مہربانی ہے آپ کی۔"

اور ستیہ دیو نے کوچ پر بیٹھتے ہوئے کہا تھا "مگر یہ تو ماننا پڑے گا پروفیسر صاحب! کہ سنگیت بھی ایک ایسا نشہ ہے۔ جو انسان کی رُوح کو اپنے ہی فریب میں مبتلا رکھتا ہے۔"

میوزک کانفرنس میں حاصل کی گئی اپنی فتح پر وہ مسرور تھا اور شاید اس مسرت نے اسے قدرے جرأت بھی دے دی تھی۔ وہ ایک فن کار تھا۔ اس لئے اگر اسے آج یہ جرأت خیز مسرت نہ بھی ملی ہوتی۔ تو بھی وہ فن کی توہین ہرگز نہ برداشت کرتا۔ وہ ہنسا ضرور مگر اس کے تبسّم میں طنز کی لاکھوں بجلیاں چھپی ہوئی تھیں

اور اس نے کہا تھا "ستیہ دیو جی! فن کار کو اپنے جذبات عزیز ہوتے ہیں۔ اور ان جذبات کے سامنے وہ روح اور رُوح کے متعلق تمام چیزوں کو فضول سمجھتا ہے۔"

ستیہ دیو نے سگریٹ کا لمبا کش کھینچتے ہوئے کہا تھا۔ "تو آپ رُوح پر یقین نہیں رکھتے؟"

اُس نے جواب دیا تھا۔ "میں صرف اپنی ستار پر یقین رکھتا ہوں۔"

ستیہ دیو نے کہا تھا۔ "تو ستار سے پیٹ تو نہیں بھر جاتا۔"

اس نے کہا تھا۔ "تو روح کے وہ مسائل جو سالہا سال سے انسان کو چند سیاست دانوں کے ذہنی ڈھکوسلوں میں پھنسا کر فاقوں پر مجبور کرتے چلے آرہے ہیں۔ کیا بھوک کا صحیح علاج ہیں؟"

ستیہ دیو نے اس کی بے ہمی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا تھا۔ "تو آپ کو سیاست سے بھی دلچسپی ہے!"

اس نے کہا تھا۔ "ہر فاقہ کش کو محض اقتصادی باتوں ہی سے اُنس ہوتا ہے اور

سرمایہ پرست اقتصادیات کی بو بہ لاش پر سیاست کی بنیاد بن جایا کرتے ہیں "
ستیہ دیو نے پھر اپنی بات کے سلسلے کو پکڑتے ہوئے کہا تھا ۔ " تو آپ جب روح سے منکر ہیں ۔ تو خدا کو بھی نہیں مانتے ہونگے "

اس نے کہا تھا ۔ " اگر آپ کی خدا سے مراد ان ظالموں کی ایک پناہ گاہ ہے جو نہ جانے کب سے ان کو بے پناہ مظلوموں کے قہر سے بچا رہی ہے ۔ تو میں اس خدا سے واقعی منکر ہوں ۔ اس خیالی خدا کا خوف محض فاقہ کشوں کو جنت اور دوزخ کے تخیلی نقشے دکھا دکھا کر ان کی آنکھوں کے شعلوں کو بجھا سکتا ہے اور ان کے حوصلوں کو خرید سکتا ہے ۔ اور اگر آپ خدا کے لفظ سے محبوب مراد لیتے ہیں ۔ تو میرا خدا میرا یہ ستار ہے "

ستیہ دیو اس کی اتنی تلخ باتوں سے گھبرا اٹھا تھا ۔ اور اس نے اٹھتے اٹھتے کہا تھا ۔ " پروفیسر صاحب ! آپ ہی وہ لوگ ہیں جن کو لوگوں کی واہ واہ اتنی زیادہ خودی عطا کر دیتی ہے کہ وہ خدا تک کو بھول جاتے ہیں " اور پھر ستیہ دیو نے اس کا جواب بھی نہیں سنا تھا اور خود ہی یہ کہتا ہوا چلا گیا تھا ۔ " پروفیسر صاحب ! آپ ستار ہی بجایا کیجیے ۔ گہری بات سوچنا آپ کے بس کی بات نہیں "

اور اس کے جانے کے بعد وہ اور کملا دیر تک خاموش بیٹھے رہے ۔ قالین پر پڑی ہوئی ستار دونوں کا منہ تکتی رہی ۔ اور پھر کملا نے آہستہ سے کہا تھا " آپ نے ستیہ دیو جی کی باتوں کا برا تو نہیں مانا ؟ "

اس نے کہا تھا " باتیں تو ستیہ دیو کی سچ مچ بڑی کڑوی تھیں ۔ مگر کملا یہاں آنے کے لئے میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں "

کملا نے کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد استفساریہ لہجہ میں کہا تھا " یہاں آنے کے لئے ؟ "

اس نے کہا تھا "ہاں کملا! کاش تم ———"

اور اتنا کہتے کہتے اس نے محسوس کیا تھا کہ پاس ادب کے کسی لطیف جذبے نے اس کے لاشعور سے ابھر کر الفاظ کو جکڑ لیا ہے۔ اور اب کسی طرح بھی اس کی زبان اس کے دل کی ترجمانی نہیں کر سکے گی۔ اس لیئے اس نے بات بدلتے ہوئے کہا

"بکھرے ہوئے سروں کا ملاپ راگنی کو کتنا سندر بنا دیتا ہے۔ اور پھر راگنی لجاتی ہے۔ شرماتی ہے اور پھر گھمبیر ہو جاتی ہے"

اور پھر کملا نے کہا تھا "ہاں پروفیسر صاحب!"

اس نے کہا تھا "اور راگنی کے اس سندر روپ کو دیکھنے کے لیئے فن کار کو کتنی محنت کرنی پڑتی ہے۔ رات کو جب دنیا سوتی ہے۔ غریب فن کار راگنی کی اس ایک جھلک کو دیکھنے کے لیئے مختلف سروں کے دروازے کھٹکھٹایا کرتا ہے کتنی مصیبتیں اس کو سہنی پڑتی ہیں اپنے آدرشوں کے درشن کے لیئے۔ یہی سوچ کر میں بھی یہاں آنے کے لیئے سب کچھ برداشت کرنے کے لیئے تیار ہوں"

کملا بہت سنجیدہ ہو گئی۔ وہ بولی "آپ نے سکھایا ہے کہ اگر سے درست جا رہی ہو۔ تو اس کو تلمبت کر دینے سے راگنی کا ٹھاٹھ نہیں بگڑ جاتا ہے"

اس نے کہا تھا "ہاں کملا!"

اور پھر کچھ دیر کے لیئے دونوں ہی چپ ہو گئے تھے۔ اور پھر وہ سوچتے سوچتے بول اٹھا تھا۔

"راگنی کے ٹھاٹھ کو بگاڑے بغیر راگنی کو درست سے تلمبت بھی تو وہی فن کار کر سکتا ہے۔ جس کو یہ یقین ہو چکا ہو۔ کہ یہ راگنی اس کی اپنی راگنی ہے ———

اور اسے اپنی اس راگنی پر اختیار ہے"

کملا نے سر جھکاتے ہوئے کہا تھا۔ "کبھی کسی راگنی نے کبھی فن کار سے یہ تو

ہرگز نہ کہا ہوگا۔ کہ اُسے اس پر اختیار ہے "!

اس نے کہا تھا "مگر راگنی احساس تو کرا دیتی ہے "!

کملا کے لہجہ میں حیا کی پاکیزگی تھی۔ جب اس نے کہا تھا۔ "اور اگر راگنی کو احساس کرانا ہی نہ آتا ہو "!

اور اتنا کہتے کہتے اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ مگر کملا کی اس پہیلی نے اس کی اپنی زندگی کی پیچیدہ ترین پہیلی کو ایک ہی لمحہ میں سلجھا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے کملا کے ہاتھ سے ستار لے لی۔ بے جان تاریں جھوم اٹھیں۔ نغموں سے کھیلتے کھیلتے اس نے کہا تھا۔

"کملا تم مجھے اب پروفیسر صاحب نہ کہا کرو۔ رمن کہا کرو "!

کملا کے لبوں نے شکر یا شی کی تھی "سب کے سامنے بھی ———— "

اور دو دو حوں کے ہلکے ہلکے قہقہے ستاروں کی جھنکاروں میں کھو گئے۔

اور پھر ———— اس کے تصور نے عہدِ گزشتہ کے ایک اور نقش کو اُبھارا ————

کلکتے میں میوزک کانفرنس تھی۔ کملا مقابلہ میں شریک ہو رہی تھی۔ ڈپٹی صاحب نے ستیہ دیو کے اعتراض کے باوجود کملا کو اس کے ہمراہ روانہ کیا تھا۔ دونوں فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سوار تھے۔ کلکتہ میل فراٹے بھرتی ہوئی اپنی منزل کی طرف اڑتی چلی جا رہی تھی۔

دونوں خاموش تھے ———— اور پھر کملا نے سلسلۂ گفتگو کا آغاز کیا "ستیہ دیو جی نے پڑھائی بند کر دی ہے اور روئی کا کارخانہ کھول لیا ہے "!

اس نے جواب دیا "تب تو پہنچ گئے اپنے ٹھکانے "!

کملا نے پُوچھا "کیا مطلب "؟

اُس نے کہا تھا "سرمایہ داروں کے بیٹے اکثر انہیں نالیوں پر سوچا کرتے ہیں "!

کملا نے پھر پوچھا۔ "یعنی"

اس نے کہا تھا۔ یعنی یہ کہ سرمایہ داری ہنسے گی بھی تو لاکھوں ارمان دم توڑنے لگیں گے۔ اور مفلسی جھوٹ بھی بولے گی تو محض اس لئے کہ کسی شکستہ دل کی آرزوئیں چند لمحوں کے لئے ہی سہی مگر مسکرا تو سکیں ——— اب دیکھنا کتنے مزدوروں کی ہڈیاں روئی کے ساتھ دھن دی جائیں گی۔"

کملا شاید اس وقت تلخ باتوں کے لئے تیار نہیں تھی۔ اس نے کہا تھا۔

"رمن جی! کیا سچ مچ آپ غریب ہیں"؟

اس نے کہا تھا۔ "اس میں کیا شک ہے"۔

کملا نے پوچھا تھا۔ "کیا اسی لئے آپ نے شادی نہیں کی"؟

اس نے کہا تھا۔ "شاید یہ بھی ایک وجہ ہو"۔

کملا نے کہا تھا۔ "مگر آپ کا نام تو بہت ہے"۔

اس نے کہا تھا۔ "یہ بھی سرمایہ داری کا ایک ادنےٰ سا کرشمہ ہے ——— زرپرستوں کا سماج غریب کو نام تو دے دیتا ہے۔ مگر روٹی نہیں دیتا ہے۔ جب تک فن کار سٹیج پر ہے سرمایہ دار چیخ چیخ کر اس کے فن کی داد دیتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ آرٹ کو سمجھتے ہیں بلکہ محض اس لئے کہ دوسرے انہیں فن فہم سمجھیں۔ ان کے دئے ہوئے تمغے ان کی اپنی جہالت کی سندیں ہوتے ہیں"۔

کملا نے کہا۔ "کاش! میں آپ کی تکلیفوں میں کچھ آپ کے کام آسکتی"۔

کملا کی اس بات نے اس کے لطیف جذبات کو چھیڑ دیا۔ وہ بول اٹھا۔ "تمہاری قربت نے ہی کملا میری تکلیفوں کو بہت حد تک رفع کر دیا ہے۔ مجھ میں جوش اور ہمت

پیدا ہو گئی ہے۔"

اور کملا نے کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا "آپ کتنے اچھے ہیں۔"

اس نے جواب دیا تھا " اور تم کتنی اچھی ہو کملا ______"

اور پھر اس نے سوچ سوچ کر کہا تھا "مگر میں جانتا ہوں کملا کہ تمہاری یہ قربت میری جاگتی آنکھوں کا خواب ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ اس سماجی نظام کا ہاتھ کبھی کسی فن کار کے سپنوں کو نہ بکھیرے یہ سماج اکثر غریب آرٹسٹ کے اندر سے سکون چھین کر اس کی آنکھوں کے پیچھے اشکوں کا خزانہ ہی دفن کرتی ہے۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں نشتر بردار آہوں کے ذخیرے ہی جمع کرتی ہے۔ میں جانتا ہوں ہمارا یہ ساتھ عارضی ہے۔ ریل گاڑی کے مسافروں جیسا عارضی ساتھ۔ دو اجنبی ملتے ہیں۔ پھر گھل مل جاتے ہیں۔ پھر چند لمحات کے لئے ایک دوسرے کے درد کے شریک ہو جاتے ہیں۔ پھر بچھڑ جاتے ہیں۔ اور پھر بچھڑتے ہی ایک دوسرے کو بھول جاتے ہیں۔ تم ایک نہ ایک دن ضرور کسی ستیہ دیو کے ساتھ منسوب کر دی جاؤ گی اور پھر تمہاری یاد محض میری ستار کے تاروں میں ایک لافانی درد بن کر ڈھل جائے گی۔"

اتنا کہتے کہتے اس نے محسوس کیا تھا جس طرح آسمان پر ستارے پیچھے دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ ایسے ہی کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے پلکوں کے موتی سرمئی بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔ وہ بولا "میں جانتا ہوں کہ تمہارے آنسوؤں میں گنگا کی دوشیزگی اور جمنا کی عفت ہے۔ مگر میں یہ بھی تو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ کہ ایک نہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب ذات پات کا سوال اور مذہب کا زہر تمہارے سماجی کے شعور کو بے جان کر ڈالے گا۔ اور پھر ان پاک آنسوؤں کی فریاد خاک میں مل جائے گی۔"

کملا کی ہچکیوں نے مشورہ دیا۔ "آپ کی جرأت میرے غریب آنسوؤں کو خاک میں ملنے سے بچا سکتی ہے۔"

اس نے پوچھا تھا۔ "یعنی"

اس بار کملا نے نہ جانے کیسے صاف کہہ دیا۔ "چلئے کلکتہ چلنے کی بجائے کہیں اور چلیں"۔ اور اتنا کہتے کہتے کملا نے اپنا سر اس کے کندھوں پر رکھ دیا تھا۔

اس نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔ "مجھ سے یہ نہ ہوگا کملا اپنے جذبات کو سرخرو کرنے کے لئے ایک فن کار دنیا کو اپنے محبوب اپنے دوسرے فن کاروں اور اپنے اصولوں پر قہقہہ زن ہونے کا موقع نہ دیگا ایسا ہو جانے کے بعد لوگ تمہاری ذات پر انگلیاں اٹھائیں گے۔ عشق فنا ہو جائے گا۔ مگر حسن کی آبرو پر آنچ نہ آنے دیگا۔"

ریل کا سفر یونہی کٹ گیا۔

اور پھر اس کے گھبرائے ہوئے تصور نے ڈرتے ڈرتے زندگی کے اس رخ سے نقاب اٹھالی جس رات ستارے کسی مجروح کی آرزوؤں کی طرح سسک رہے تھے۔ زرد رو چاند آسمان کی نیلی گہرائیوں میں تنہا بھٹکتا پھر رہا تھا۔ ہوائیں سسکیاں بھر رہی تھیں اور کملا نے اس سے تنہائی میں کہا تھا۔ "ایک وعدہ دیجئے۔"

اور اس نے بلا تامل وعدہ دے دیا تھا۔

اور کملا نے کہا تھا۔ "کم از کم دس سال تک آپ کسی کے سامنے ستار نہیں بجائینگے۔"

اس نے سکتے میں آتے ہوئے پوچھا تھا۔ "یعنی"

آبدیدہ کملا نے کہا تھا۔ "رمن جی! آپ نہیں جانتے کہ آپ کی ستار کے تاروں کی جھنکاروں میں وہ جادو ہوتا ہے جو میرے جیسی سننے والیوں کو چند لمحات کے لئے

ایک ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں ماضی کے دھند لکے نہیں ہوتے۔ حال کے سائے نہیں ہوتے۔ مستقبل کی پرچھائیاں نہیں ہوتیں۔ اس دنیا میں پہنچتے ہی آدمی نڈر ہو جاتا ہے۔ سماج اور سماج کے بندھنوں کو کھلونا سمجھنے لگتا ہے۔ جذبات کی وہ دنیا حسین ضرور ہے مگر کسی مجبور کی مجبوریوں کا مداوا نہیں ہے۔ میں بھی اس دنیا میں پہنچ کر نڈر ہو گئی تھی۔ مگر مجھے یہ معلوم نہ تھا۔ کہ میں اتنی کمزور ہوں۔ کہ پتاجی کے حکم کے سامنے سر نہ اُٹھا سکونگی۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ میری شادی ستنیہ دیو سے کر دینگے۔ کل میری منگنی ہے ———— ہاں آپ اب دس برس تک کسی کو ستار نہیں سنائیں گے۔ دس برس بعد شاید آپ بوڑھے ہو چکے ہوں گے۔ اور پھر آپ کی ستار کے نغموں کے اسیر آپ کو عزت دینگے۔ دل نہ دے سکیں گے۔ اور مجھ ایسی کتنی لڑکیاں بدقسمتی کا شکار ہونے سے بچ جائیں گی۔"

اور اس نے کہا تھا "دس سال تک کملا! اب کوئی میری ستار نہیں سن سکیگا۔ میں تمہیں تمہاری منگنی پر منہ مانگا تحفہ دیتا ہوں۔"

کملا کی ہچکیاں بندھ گئیں اور وہ پلکوں کے آنسو پونچھتا ہوا نہ جانے کہاں چلا گیا۔

کچھ لوگوں کا کہنا تھا۔ کہ ان بلند پہاڑیوں کے پیچھے جہاں ابابیلوں کے رومان شرمندۂ تعبیر ہوتے ہیں۔ دس سال اس نے مشق و ریاضت میں گزار دئے۔ اس عرصہ کملا کو اس کا پتہ نہ تھا۔ اور کملا کی اس کو کوئی خبر نہ تھی۔ مگر دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے۔ جو ابھی تک فن کار کو نہیں بھولے تھے۔

آج پورے دس سال بعد وہ میوزک کانفرنس میں شریک ہو رہا تھا اور لوگ

رکی رکی سانسیں اور دھڑکتے ہوئے دل لئے اس کے منتظر تھے۔

دس سال کا یہ قیمتی عرصہ اس نے گمنامی کی نذر کر دیا تھا۔ وقت کی تیز رفتاری نے اس کے ماتھے پر گہری لکیریں کھینچ دی تھیں۔ اس کے رخساروں کو سمندر کی جھاگ کی مانند جھریوں سے بھر دیا تھا۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال بُری طرح بڑھے ہوئے تھے۔ وہ ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ اور یہ من ایک ادھیڑ عمر کی بوسیدہ سی لاش تھی۔

وہ گرین روم میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ ان دس برسوں نے کملا کے ماحول نے۔ اس کی عادات۔ اس کی زندگی اور اس کے جسم پر نہ جانے کیا اثر ڈالا ہے۔ کیا وہ آج میوزک کانفرنس میں آئے گی؟ غالباً وہ ضرور آئے گی۔ کانفرنس اس کے والد کے زیرِ سایہ ہی تو منعقد ہو رہی ہے۔

ایک کارکن نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔ "اس کے بعد آپ کا پروگرام ہے۔"

وہ ستار کے تار ملانے لگا۔ گرین روم سے نکل کر وہ جس وقت اسٹیج پر آیا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ طلبا کی سیٹیاں فضا میں تحلیل ہو گئیں اور پھر ماحول پر خاموشی کا عالم طاری ہو گیا۔

اس نے سامعین کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ اور ستار ایک زانو کے نیچے دبا کر بیٹھ گیا۔ دس ہزار انسانوں کے اس وسیع مجمع میں اس کی نگاہیں کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ اسٹیج کے قریب بیٹھے ہوئے ڈپٹی صاحب پر اس کی نظر پڑی۔ ڈپٹی صاحب نے سر جھکا لیا۔

وہ کچھ سوچنے لگا۔ اور پھر اس کی مضراب کو حرکت ہوئی۔ نغمے آہستہ آہستہ بیدار ہونے

لگے پیلو کا الاپ کرد ٹمیں لے رہا تھا ہال کے وسیع خلا میں موسیقی کے دائرے سے تیرنے لگے۔ ایک بھینی بھینی مستی کا سیلاب امنڈ رہا تھا۔ اس نے سر کو خفیف سا جھٹکا دیا۔ پیلو کی گت تھر کنے لگی۔ گندھارا اور مکھار رقص میں آ گئے۔ طبلے کا مدھر مدھر ٹھیکہ چاندی کی کٹوریوں میں آبشار کی بُوندوں کے ٹپکنے کا عالم پیدا کر رہا تھا۔ سحرِ موسیقی تھا۔ یا اس کے فن کی انتہا معلوم ہوتا تھا۔ کہ بجلی کے بڑے بڑے قمقموں پر سرزنش کا عالم طاری ہو گیا ہے اور سامعین کے دھڑکتے ہوئے دل چند لمحات کے لئے بند ہو گئے ہیں۔ راگنی لہراتی بل کھاتی ہوئی جھوم رہی تھی۔ اس نے مضراب کو حرکت دی جھالا متوالی ناگن، کی طرح لہرا اٹھا طبلہ والا اس کی تیز رفتاری کا ساتھ نہ دے سکا۔

رمن نے دیکھا۔ ڈپٹی صاحب کی آنکھوں میں تحسین و آفرین کے ملے جلے جذبوں کے ساتھ چند آنسو بھی تھے۔ اس نے ستار سے ہاتھ اٹھا لیا۔ عوام نے فیصلہ دے دیا۔ کہ رمن ان دس برسوں میں ستار کا پیغمبر بن چکا ہے۔

وہ ڈپٹی صاحب سے تخلیہ میں ملتے ہی بول اٹھا۔ "ڈپٹی صاحب! یہ نہ کہئے گا کملا مر گئی ہے۔ میں نے دس برس تک اس کی یاد ہی سے اپنے نغموں کو زندہ رکھا ہے۔ وہ کیسی ہے۔"

ڈپٹی صاحب کی آواز گویا کسی گہرے کوئیں سے بلند ہوئی۔ "وہ زندہ ہے"۔

اور پھر وہ خود ہی اٹک اٹک کر بولے۔ "میں نے اس کی شادی ستنیہ دیو سے کر دی تھی۔ وہ ستنیہ دیو کو اپنا جسم تو دے سکی۔ مگر محبت نہ دے سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ اس ضدی چھوکرے نے میری بیٹی پر انتہائی ظلم ڈھائے۔ وہ یہ سب ظلم برداشت کرتی رہی۔ پچھلے ماہ ستنیہ دیو نے اسے اپنے

گھر سے نکال دیا تھا۔"

وہ بڑبڑایا "یہ تو ہمارے سماج کے بوسیدہ نظام کی دین ہے ڈپٹی صاحب! مجھے افسوس ہے کہ آپ حاکمِ انصاف ہوتے ہوئے بھی دو روحوں کے ساتھ انصاف نہ کر سکے۔"

ڈپٹی صاحب کی آواز مرجھا گئی۔ "ستیہ دیو نہ جانے کیسے اس پر چال چلن کا بھی الزام لگا رہا ہے۔" اور پھر ڈپٹی صاحب جذبات کی شدت میں بولنے لگے۔

"رمن! تم گھر چلو۔ کملا بے گناہ ہوتے ہوئے بھی خود کو گناہگار محسوس کر رہی ہے۔ میں اپنی بیٹی کی زندگی کو ہرگز تباہ نہ ہونے دونگا۔ میں نے اسے بڑے لاڈ پیار سے پالا ہے رمن ———— ! اگر تمہارے دل میں جرأت ہے۔ اور اسے تمہارے ساتھ تسکین مل سکتی ہے تو میں اسے تمہارے سپرد کر دونگا۔"

وہ ڈپٹی صاحب کے ساتھ ان کے گھر آ گیا۔ ڈپٹی صاحب اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر خود اندر چلے گئے۔ کچھ دیر کے بعد وہ بولے "سامنے دیوار پر لٹکی ہوئی تصویر کو کیا دیکھتے ہو رمن! کملا سو رہی ہے، مگر تم اس کے سونے کی پروا نہ کرنا۔ وہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہو گی۔ اپنی ستار اندر لے جاؤ۔ اور اپنے نغموں سے کہو وہ اسے جگائیں ————"

رمن ستار لے کر اندر چلا گیا۔

ڈپٹی صاحب نے جیب میں سے خط نکالا۔ لکھا تھا۔ پتا جی! آپ تو رمن کو فضول لینے چلے گئے۔ نہ جانے دس برس کے اس طویل عرصہ نے ان کے دماغ میں احساس کی لطافت کو برقرار رکھا ہے یا نہیں۔ ممکن ہے وہ بھی مجھے

گناہ گار سمجھیں ۔ عورت بہت کمزور ہوتی ہے پتا جی ۔ میں زندہ رہ کر آپ کی بے عزتی کا باعث نہیں ہوں گی ——

دنیا ستنیہ دیو ہی کا یقین کرے گی ۔ اور چیخ چیخ کر کہے گی کہ کملا گنہگار ہے ۔ وہ گناہ کی جیتی جاگتی نشانی اپنی گود میں لئے گھومتی ہے ۔ میں اب زندہ رہنا نہیں چاہتی ۔ میں بھگوان کے پاس جا رہی ہوں ——

ڈپٹی صاحب نے سنا کملا کے کمرے سے رمن کی ایک طویل چیخ بلند ہوئی ۔ ستار شاید فرش پر آ گرا ۔ ایک جھنکار سی گونج اٹھی ۔ ڈپٹی صاحب کے صبر کا بند ٹوٹ گیا ۔ وہ چیخے "رمن ! تم تو اپنے فن کے پیغمبر ہو ۔ کیا تمہارے نغمے بھی میری سوتی ہوئی بیٹی کو نہ جگا سکیں گے ——"

اور اندھیرا بڑھتا گیا

یہ وُہ زمانہ تھا جب بڑے سے بڑے جوان حوصلہ لڑکے ماسٹر ہر بالک رام کے نام سے کانپتے تھے۔ طلبا اُنہیں "ہلاکو" کہا کرتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ کلاس میں آکر بیٹھتے ہی ایک غضبناک نگاہ سہمی ہوئی جماعت پر ڈالتے اور پھر کوئی ذرا سا بہانہ ڈھونڈ کر کسی بھی ایک لڑکے کو اپنے قریب بلاتے۔ —— اور پھر یک لخت تھپڑ، گھونسہ گالیاں۔ بید —— اور دبی بھنچی چیخیں اور بھنبھناتی ہوئی سسکیاں ان کی بلا سے اگر لڑکے کے مُنہ سے خون نکل آیا ہے یا ناک پھُول کر کُپا بن گئی ہے یا کان جھنجھنا رہ گئے ہیں اور پھر گویا جماعت کے پچاس لڑکوں کی سانسیں بھی بند ہو جاتیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دو دفعہ پرنسپل صاحب نے بھی انہیں حد سے زیادہ ہلاکو نہ بننے کی تنبیہہ کی تھی۔ مگر ہر بالک رام نے تو گویا قسم کھائی تھی کہ وہ ہر ایک بالک کا بھرکس نکال دینگے۔ آپ پڑھاتے تھے ہماری نویں جماعت کو مگر نقصان بتایا کرتے تھے چانٹے کھانے کا۔ ایک دن اپنی سسُرال کا جغرافیہ بیان فرما رہے تھے کہ مجھے یونہی چھینک آگئی۔ حکم ہوا۔ اپنی جگہ پر کھڑے ہو جاؤ۔ میرے اوسان خطا ہو گئے ہیں

خاموش کھڑا ہوگیا۔ حکم ہوا۔ ہمارے قریب آؤ۔ میں ان کے قریب پہنچا۔ حکم ہوا پوچھو میں نے کیا قصور کیا ہے۔ میں نے مریل سی آواز میں اپنا قصور پوچھا۔ ماسٹر صاحب کڑکے "تم ہمیں آنکھ مار رہے تھے"۔ یا خدا آنکھ مارنا تو درکنار اس وقت تو مجھے آنکھ جھپکانا بھی نہیں آتا تھا۔ اور اس کے بعد تھپڑوں کی مسلسل بارش۔ گھونسوں کا لاتناہی سلسلہ ــــــ لطف دیکھئے میرے بڑے بھیا جو دسویں جماعت میں پڑھتے تھے ان کے شاگردِ خاص تھے۔ اور گویا بالکل ماسٹر صاحب کے نقشِ قدم پر چلنے کے لئے مرے جا رہے تھے۔ خیر یہ تو اپنے اپنے آئیڈیل کا سوال ہے۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ آخر بھیا کو رام ناتھ سے کیا دشمنی تھی۔ مانا کہ وہ شنکر حلوائی کا لونڈا ہے تو اس سے کیا ہوا ماسٹر ہر بالک رام بھی تو بھیکو چمار کی اولاد ہے۔ کان پک گئے تھے بھیا کے یہ احکام سنتے سنتے۔ خبردار! اگر تجھے کبھی میں نے رام ناتھ کے ساتھ باتیں کرتے بھی دیکھا مار مار کر دُنبہ بنا دُونگا۔ وہ آوارہ ہے۔ بدمعاش ہے بد چلن ہے۔ انگریزی بال رکھتا ہے۔ قوالی گاتا ہے اور نہ جانے کیا کیا کرتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے رام ناتھ کی ایسی ہی باتیں اچھی لگتی تھیں۔ بکنے والے اسے 'پہلوان' کہتے تھے۔ "دل لگی ہی دل لگی میں دِل گیا" قوالی گاتا گاتا جب وہ ڈھولک پر تھاپ پڑتے ہی سر کو جھٹکا دے کر ماتھے پر جھومتی ہوئی زلفوں کو پیچھے لے جاتا تو مزا آجاتا۔ سینما گھر کے چار آنے اور نو آنے والے درجوں کے گیٹ کیپر جس وقت اسے دیکھ کر مسکراتے تو اسے تو سرور آتا ہی ہوگا مجھے بھی اسکی دوستی پر کچھ کچھ فخر ہونے لگتا تھا۔ کتنے رومانی قصے تامیوں کے اسے یاد تھے۔ وہ اپنی واسکٹ کے بٹن کھول کر سپاریوں کی ایک چٹکی منہ میں ڈالتا اور دانت بھینچ کر جس وقت نتھنوں کو پھیلاتا تو

میں فوراً سمجھ جاتا۔ کہ اُس کی نگاہوں میں اس کا کوئی کارنامہ تیر رہا ہے اور میں بغیر سوچے سمجھے کہہ دیتا "ہاں تو رام ناتھ پھر کیا ہوا" وہ میرے اشتیاق کو دبوچتے ہی مسکرا پڑتا۔ اور شروع ہو جاتا۔ "ایک دن نیند نہیں آ رہی تھی۔ کروٹیں بدلتے بدلتے آدھی رات ہو گئی۔ کچھ کچھ گرمی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا چلو کالج والے باغیچہ میں "بنٹا دھار" ہو جائیں۔" "بنٹا ڈھار" اس کا تکیہ کلام تھا۔ کبھی کبھی وہ لفظ "اڑن چھو" بھی جاو بیجا استعمال کر جاتا۔ ہاں تو کہتا "بس بھیا چار دیواری پھاند کر پہنچا ہوں جو باغ میں تو چبوترے پر چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں جا لیٹا اسی چاندنی میں، ابھی جھپکی ہی آئی تھی۔ کہ کالج کے اندھیرے برآمدہ میں ایک ہلکی سی چیخ سنائی پڑی۔ اور اس کے بعد کچھ کھسر پھسر۔ میں نے کہا ہوگا کوئی سالا کیوں کسی کے رنگ میں بھنگ ڈالیں۔ مگر اب جو چیخ سنائی دی۔۔۔ تو طبیعت اڑن چھو ہو گئی۔ اب نہ مجھ سے رہا گیا بجرنگ بلی کا نام لے کر جو لگائی ہے ایک چھلانگ تو جا پہنچا برآمدہ میں۔ وہاں دیکھتا کیا ہوں۔ کہ بنٹا ڈھار" اور اتنا کہہ کر رام ناتھ نے تاج مارکہ بیڑی بنڈل نکال کر ایک بیڑی خود سلگائی اور ایک مجھ کو دی۔ میں نے احتیاطاً چاروں طرف دیکھ کر ایک لمبا کش کھینچتے ہوئے کہا۔ "رام ناتھ بیچ میں نہ اٹک جایا کرو۔ وہاں پھر کیا ہوا" رام ناتھ نے منہ سے دھوئیں کا بادل چھوڑتے ہوئے کہا۔ "ہاں تو دیکھتا کیا ہوں کہ وہ ٹامی تو انتظار میں ٹہل رہے ہیں۔ ایک سالا کسی عورت کے ساتھ منہ کالا کر رہا ہے۔ بس بھیا خون ہی تو کھول اٹھا ان حرامیوں نے بھگت سنگھ کو پھانسی دی تھی اور اس وقت سالے مزا کر رہے تھے۔ اتنے میں ہوا کیا کہ ایک گورا ڈیم بلیڈی اینٹی سینٹی کہہ کر جھپٹا ہے جو مجھ پر تو پہلے تو میں سٹپٹایا۔ مگر پھر جو میں نے گورو کا نام لے کر لگائی ہے فلا جنگ تو

اڑان چھو۔ تمہاری جان کی قسم بیٹا لگے زمین چاٹنے۔ دوسرے کو میں نے وار کرنے کا موقع ہی نہیں دیا وہ دھوبی پاٹ مارا ہے کہ بنٹاڈھار۔ اور اتنی دیر میں وہ تیسرا ابھی سنبھل ہی رہا تھا کہ دھرا ہے جو میں نے بال سانگڑے پر تو چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ بھاگے سالے اپنی نوکیلی ٹوپیاں چھوڑ کر۔"

اس نے میری نگاہوں میں بیدار ہونے والے سوال کو اپناتے ہوئے پوچھا۔ جانتے ہو وہ کون تھی؟ میں نے بے ساختہ پوچھا کون تھی۔ رام ناتھ نے بھویں چڑھاتے ہوئے پوچھا" تم نے بتایا نہیں کہ بجرنگی داس کی لونڈیا کے ساتھ پھر کیا ہوا"۔ میں نے چڑ کر کہا۔" سو دفعہ بتا چکا ہوں کہ میں نے تمہارے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق اس کو دیکھ ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ مسکرانے لگی۔ دوسرے دن اس کو چھیڑا۔ وہ رونے لگی۔ میں تو ڈر گیا کہ اب آیا وہ بجرنگ داس بھیا۔ مگر یہ بھی وہم تھا۔ میں نے اُسے چھٹی لکھی۔ اس نے جواب دیا۔ اور اس کے بعد اس عشق میں خود بخود بریک لگ گیا۔ شاید بھیا نے کچھ اوپر ہی اوپر کر دیا۔ آخر وہ تاڑ گئے تھے نا سب کچھ"۔ رام ناتھ قہقہہ لگا کر بولا " تو ڈرپوک کیا کرے گا عشق۔ اچھا خیر تو وہ بھی گنگا دین مالی کی لونڈیا سالی رام کلی ———— سہمی کھڑی تھی ایک کونہ میں تم آ کے دیکھتے اس وقت تو مزا آجاتا۔ سالی ہاتھ نہیں رکھنے دیتی تھی اب بھیگی بلی بنی تھی۔ ایمان سے بھیا تمہاری جان کی قسم پہلے تو جی میں آئی کہ ایک جھانپڑا ایسا ماروں کہ طبیعت ہری ہو جائے۔ مگر پھر خیال آیا کہ عورت پر ہاتھ کیا اٹھائیں سالی پہلے ہی مر چکی ہے۔ میں نے بس اتنا پوچھا " یہ کیا ہو رہا تھا رام کلی"۔ فوراً پیر پکڑ لیے اس نے میرے " تم مجھے جان سے مار دو۔ بھیا سے نہ کہنا" میں نے بھی موقع تاڑا۔ اور

اکڑ کر کہا۔ "اور قیمت دوگی اتنی بڑی بات چھپانے کی"۔ پہلے تو چپ رہی حرامزادی اور جب میں چلنے کو تیار ہوا۔ تو گڑگڑا کر میری طرف دیکھنے لگی۔ تو اپنا تو بھیا اصول ہے کہ قدموں میں گرے ہوئے پنچھی کو کبھی ٹھوکر نہیں مارتے۔ یہ کام چڑیمار و نکا ہے"

ایسے کارنامے بیان کرنے کے بعد رام ناتھ قہقہہ لگاتا۔ میں سوچنے لگتا۔ رام ناتھ کتنا خوش قسمت ہے ——— اور ایسے رام ناتھ سے بھیا نفرت کرتے تھے۔

ایک دن ہم لوگ سینما کا ایک کھیل دیکھنے گئے بھلا سا نام تھا اس کا ——— ہاں بھولا شنکار ——— راجوری کو دیکھا طبیعت ڈانواڈول ہوگئی۔ دل میں ہوک سی اٹھنے لگی۔ جی میں ارمان چٹکیاں بھرنے لگے۔ فیصلہ کر لیا۔ کہ شادی کرونگا تو ایسی ہی جورو سے کرونگا۔ ورنہ عمر بھر کنوارہ ہی رہونگا اور رام ناتھ نے تو حد ہی کر دی۔ سینما گھر سے باہر آتے ہی اس نے ایک خوانچہ والے سے زبردستی لڑائی مول لی۔ اور بالکل ہیمیو ربہ کے انداز میں جو ایک ٹھنگنی دی ہے اس کو تو وہی بڑے ڈھول چاٹ کر اپلی کی چپٹی بن گئے۔ گھر لوٹے ہی تھے کہ بھیا نے مزاج پرسی شروع کر دی۔ حکم ہوا۔ "کونسی کتاب خریدی ہے آج"۔ میں نے ایک پرانی کتاب بھیا کو دکھائی۔ نئی کتاب کونسی لائی تھی۔ وہ تو بہانہ بنایا تھا سینما دیکھنے کا بھیا نے جو ایک تھپڑ رسید کیا ہے تو آنکھوں میں سے بجلی کی تار دوڑ گئی۔ مگر پھر سوچا پرانے زمانے میں عاشق لاکھ لاکھ مصائب جھیلتے تھے کہیں کوئی جوئے شیر نکال رہا ہے تو کوئی صحرانوردی کر رہا ہے۔ اگر ہمارے ایک تھپڑ پڑ گیا تو کونسی خدائی لٹ گئی۔

ایک دفعہ تو رام ناتھ نے کمال کر دیا۔ پانی کے پائپ کے سہارے بابو گور سہائے کے مکان کی چھت پر جا چڑھا بالکل انڈین ڈگلس کے انداز میں میں رامناتھ کے پھرتیلے جسم کو رشک و حسد کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میرا یہ پختہ یقین تھا کہ ایک بار کوئی فلم کمپنی کا ڈائرکٹر رام ناتھ کو دیکھ لے تو ہاتھ جوڑ کر کمپنی میں بھرتی کر لے گا۔ ایک دن ہم دونوں نور پور کا میلہ دیکھنے گئے۔ کیسی صفائی سے رام ناتھ چلتی گاڑی میں ایک ڈبہ سے دوسرے ڈبہ میں جا پہنچا۔ ای بلیمور یہ بھی طوفان میل میں یہ صفائی نہیں دکھا سکا۔ ایسے ہونہار رام ناتھ کے ساتھ ایک "بھیا" کیا لاکھ "بھیا" بھی کہتے۔ کہ میں قطع تعلق کر دوں تو ہر گز نہ کرتا۔ ایسی تیسی "بھیا" کی کھدر کی ٹوپی اور جواہر واسکٹ پہن کر "بھیا" خود تو نیتا بننے کے خواب دیکھ رہے تھے اور اگر ہم ایکٹر بننے کی فکر کرنے لگتے تو بھیا کی جان پر بن جاتی۔

بہت دنوں سے رام ناتھ نظر نہیں پڑا تھا۔ بہن سے سنا تھا کہ آجکل رام ناتھ گھوڑے کی سواری سیکھ رہا ہے۔ اچانک وہ مجھے منی چاٹ والے کے خوانچہ پر مل گیا ـــــــ چاٹ کھانے کے بعد ہم لوگ گنگا کی طرف چل پڑے کسی بات کے سلسلہ میں میں نے رام ناتھ سے کہا۔ "بھیا تم تو فلم کمپنی میں شکل دکھاتے ہی بھرتی کر لئے جاؤ گے۔ مجھے کوئی دو ٹکے کو بھی نہ پوچھے گا۔" رام ناتھ نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا۔ "تم ہو چوغمٹ ـــــــ ابے بھگوان نے تجھے جیسی شکل دی ہے بہت کم آدمیوں کو دیتا ہے۔ راجہ سینڈو جیسا ماتھا ہے۔ ایشور لعل کی طرح ہنستے ہو۔ نثار جیسا گلا ہے۔ مگر تم ہو کہ اپنا چوکھٹا ہی بگاڑتے رہتے ہو۔ ایسے انگریزی بال رکھو۔ کیا سرسوں کا تیل ڈال کر چپڑ، یا چمکائے گھومتے ہو۔ ذرا

پاؤڈر کریم لگایا کرو۔ ـــــــــ قاعدہ سے ہنسا کرو ـــــــــ بتیسی نکالتے ہو تو معلوم ہوتا ہے دیہاتی جوتے کے ٹانکے ٹوٹ رہے ہیں۔ یہ دھوتی چھوڑ دو سوٹ بوٹ پہنا کرو۔ پھر چلو ذرا بھیٹی دیکھو ایک ہی نظر میں راجوری تم پہ عاشق ہوتی ہے یا نہیں۔ میں سوچ میں پڑ گیا تحت الشعور کی نازک انگلیاں مستقبل کے دھندلے چہرے کو بے نقاب کرنے لگیں۔

میں تخیل کے سنہری جالوں میں پھنستا چلا جا رہا تھا۔ رام ناتھ نے سپاری کی چنگی منہ میں ڈالتے ہوئے گویا میرے ذہن کے ہر ایک نقش کو پرکھ لیا۔ وہ بولا "کیا سوچ رہے ہو؟" میں نے چیل کی بدھی کستے ہوئے جواب دیا "سوچ رہا ہوں انگریزی بال تو آج ہی رکھ لوں۔ مگر بھیا کی نظر پڑ گئی۔ تو دن میں تارے نظر آنے لگیں گے۔" رام ناتھ نے آسمان کی بلندیوں کو ایک ہی نگاہ میں ماپتے ہوئے کہا "برا تو نہ مانو گے اگر ایک بات کہوں" میں نے کہا "ایک نہیں دو کہو ـــــ" رام ناتھ بولا "میں نے تمہارے بھیا کو بجرنگی داس کی لونڈیا کے ساتھ نظر بازی کرتے دیکھا ہے۔" میرے خیالات کو ایک جھٹکا سا لگا ـــــ بھیا کو میں سنگ دل مہاشہ قسم کا انسان سمجھتا تھا۔ مجھے ان سے اس حرکت کی توقع کبھی نہیں تھی۔ رام ناتھ بڑبڑایا "تم بالکل گدھے ہو۔ میرا یقین ہے۔ دنیا میں تم کچھ کر ہی نہیں سکتے ـــــــــ تم کتنے بزدل کتنے ڈرپوک ہو۔" میں نے کہا "ہو سکتا ہے کہ میں ڈرپوک ہوں۔ مگر رام ناتھ میں کیا کر سکتا ہوں" رام ناتھ کے خشک لہجہ نے الفاظ اگلے "کیا نہیں کر سکتے ہو۔ کیا تم اپنے بھائی کو یہ نہیں بتا سکتے کہ اب تم اپنے بھلے برے کو خود اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔

کیا تم دودھ پیتے بچے ہو۔ کہ زبان سے صحیح لفظ ادا نہیں کر سکتے"۔ اور رام ناتھ قہقہہ لگاتے ہوئے چل پڑا۔

مَیں نے انگریزی بال رکھ لیئے۔ دو چار دن تو بھیاؔ خاموش رہے۔ ایک دن انہوں نے آنکھیں چڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے"؟ میں نے بے رُخی سے کہا۔ "آپ دیکھ تو رہے ہیں"۔ بھیا نے تیزی سے کہا۔ "کیا تم بھی دیکھنا چاہتے ہو کہ میں کیا دیکھ رہا ہوں"۔ مَیں آج ہر بات کے لیئے تیار تھا۔ میں نے کہا "میرے انگریزی بالوں کو دیکھنے سے قبل آپ اپنے کارناموں پر بھی ایک نظر ڈال لیجیئے۔ تو بہتر ہے"۔ بھیا نے لپک کر کہا۔ "کیا بکواس کرتا ہے"؟ میں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ "بکواس نہیں بھیاؔ مجھے بجرنگی داس کی لڑکی کے بارے میں سب پتہ چل گیا ہے"۔ بھیا نے جوتا اٹھالیا میں بھی چھاتی تان کر کھڑا ہو گیا۔ بھیا ہاتھا پائی پر اتر آئے۔

رام ناتھ کے یہ الفاظ "تم ڈرپوک ہو۔ بُزدل ہو"۔ میرے تحت الشعور سے اچھل کر میری رگوں میں غیظ و غضب کے شعلے بن کر تحلیل ہو گئے۔ میں نے اُچھل کر جو ایک گھونسہ بھیاؔ کے رسید کیا۔ تو بھیا ہکے بکے رہ گئے۔ ان کے ہاتھ ان کی زبان ان کی حرکات ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ پر ایک جمود کا عالم طاری ہو گیا۔ میں غم و غصہ میں پاگل ہو گیا تھا۔ اور بھیا سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "ترلوکی آج سے تم آزاد ہو۔ اب میں تمہیں کبھی کچھ نہ کہونگا۔ میری غلطی تھی کہ آج تک میں تمہیں بچہ سمجھتا رہا ——— ترلوکی! یہ گھونسہ تم نے میرے نہیں مارا ہے۔ یہ گھونسہ لکھشمن نے رام کے مارا ہے۔ یہ گھونسہ بیٹے نے باپ کے مارا

ہے۔ یہ ایک ضرب تھی۔ جو آوارگی نے ہندوستان کی برہنہ پیٹھ پر لگائی ہے۔ اب رام ناتھ تو رام ناتھ تم طوائفوں کا مجرا بھی اس گھر میں کراؤ تو میں تمہیں کچھ نہ کہوں گا“۔ اور نہ جانے بھیا کیا اناپ شناپ بکتے رہے میں سوچ رہا تھا۔ واہ رے رام ناتھ کیا نسخہ بتایا ہے کہ ایک ہی گھونسے نے بھیا کی طبیعت ہری کر دی۔ جو آزادی اتنے دن کی منت خوشامد سے نہ مل سکی وہ ایک ذرا سے حوصلے نے دے دی۔ بوکھلاہٹ میں بھیا ایکٹر بن گئے تھے۔ کیا مزے میں کیکی بابا کی نقل اتار رہے تھے۔ جذباتی بن کر دکھا رہے تھے۔ مگر تو دیکھئے ان کے ــــــــ نوکر نے بتایا کہ بھیا نے دو دن سے کھانا نہیں کھایا۔ میں نے سوچا کھا لیا ہوگا کسی ہوٹل میں۔ مجھ پر سو کھا رعب ڈال رہے ہیں۔ ایک بات قابل غور تھی کہ بھیا کا رویہ سچ مچ بدل گیا تھا۔ اب مجھے کسی بات پر نہیں ٹوکتے تھے اب تو رام ناتھ بھی کھلے بندوں میری بیٹھک میں بیٹھا بیڑی کے کش لگاتا رہتا تھا۔ اور بھیا آنکھیں جھکائے ایک مجرم کی طرح خاموش دبے پاؤں نکل جاتے۔

میں نے سرسوں کے بھدے بدبودار تیل کی جگہ Eveniny in Paris کی کریم سر میں لگانی شروع کر دی۔ سینما کے میٹنی شو کی جگہ سیکنڈ شو دیکھنے لگا۔ کپڑوں میں لیونڈر کا استعمال بھی شروع ہو گیا۔ بڑا سا آئینہ خرید لیا گیا۔ اور باقاعدہ ایکٹنگ کی مشق و ریاضت شروع ہو گئی۔ بھیا دل پر پتھر رکھے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ مگر ان کی زبان سے کوئی کلمۂ احتجاج نہ نکلتا تھا۔ سکول میں ڈراما ہوا مجھے کتنے ہی تمغے ملے۔ سکول میں امتحان ہوا! اور میں فیل ہو گیا ــــــــ مگر میری سمجھ سے بعید تھا کہ بھیا کیوں فیل ہو گئے۔ کیا سچ مچ بجرنگی داس کی لڑکی ان کے ذہن پر اس

حد تک چھا چکی تھی۔

سینما گھر میں پہنچ کر رام ناتھ نے مہرِ خاموشی توڑ دی۔ اس نے بتایا کہ اس کے بابا نے اس دن اس کی خوب مرمّت کی ہے۔ بات محض اتنی تھی کہ دکان سے روپوں والی صندوقچی غائب تھی۔ اس رات ہم نے نادرہ کھیل دیکھا۔ کِکی بابا کے بھڑکیلے ڈائیلاگ، بلیموریہ کی پھرتی اور راجوری ــــــــ ہائے اس کے ابرؤے خم دار کیسے تیکھے تھے۔ اس کے بھاری بھاری ہونٹ شرابِ حسن سے لبریز تھے۔ اس کے چمکدار رخسار ــــــــ اس کا بیضوی چہرہ ــــــــ بلوریں گردن ابھرا ہوا گدرایا ہوا سینہ ــــــــ مرمریں بازو ــــــــ کاش راجوری میری ہو جاتی میں اس کی پرستش کرتا ــــــــ اس کو اپنے من مندر کی رانی بناتا۔ میں اس کے قدموں پر اپنا دل اپنا ایمان اپنی جوانی رکھ دیتا ــــــــ کتنا خوش نصیب ہے وہ بلیموریہ۔

رام ناتھ آج معمول سے زیادہ سنجیدہ تھا۔ کوئی ایسا طوفان اس کے دماغ میں موجزن تھا جو خاموشی کا نقاب اوڑھے تھرتھرا رہا تھا۔ کھیل ختم ہوا ــــــــ ہم سینما گھر سے باہر نکلے۔ مجھے رام ناتھ کی چپ مارے ڈال رہی تھی۔ میں نے چڑ کر کہا "ہاں بھئی اشاد خاموشی کس بات کی ہے۔ رام ناتھ نے گھنٹہ گھر کی گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہا "بمبئی چلوگے" ــــــــ میں سوچ میں پڑ گیا۔ رام ناتھ نے پھر کہا۔ "روپے میرے پاس ہیں"۔ میں نے پوچھا۔ "کتنے"۔ رام ناتھ نے جواب دیا۔ "دو سو"۔ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "پچاس روپے کی کتابیں بک جائیں گی سو پچاس کا اور بندوبست ہو جائیگا کل چلے چلیں گے"۔

اگت پوری میں گاڑی صبح نو بجے پہنچی۔ یہاں سے بجلی کا انجن گاڑی میں لگ جاتا ہے۔ اور پہاڑیوں کا ایک بے ہنگم سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ ہم دونوں کے دلوں میں امیدوں کے نخل لہرا رہے تھے۔ سٹیشن پر پیلے کپڑوں میں ملبوس خوانچے والے اکیڑ معلوم ہوتے تھے۔ انجن نے سیٹی دی۔ گاڑی اپنی جگہ سے کھسکی۔ گویا کوئی الہڑ دیہاتی دوشیزہ پازیب کی جھنکار جھنکاتی اپنی منزل کی طرف لہراتی چلی جا رہی تھی۔ مجھے تصور کے دھندلکوں پر سینما کے بڑے بڑے پوسٹر نظر آنے لگے "دل کی آرزو" ہیرو ترلوکی ہیروئین راجوری دلن رام ناتھ۔ یہ نقش بھی پھیلنے لگے۔ تخیل کی یہ رنگ برنگی لکیریں بھی پھیکی پڑ گئیں۔ دماغ نے نئے زاویے تراشے۔ میں نے دیکھا ایک بڑے سے سینما گھر میں بھیا "دل کی آرزو" دیکھنے گئے ہیں اور پردے پر مجھ کو دیکھ کر اپنے ساتھیوں سے کہہ رہے ہیں "ارے دیکھو یہ ہمارا ترلوکی ہے ——— کمال کر دیا اس نے تو ——— مجھے خواب میں بھی اتنا خیال نہ تھا کہ یہ نالائق اتنا ہوشیار نکلے گا" ذہن نے ایک اور جھٹکا محسوس کیا۔ سینما کے رسالوں میں میرے حالات چھپ رہے ہیں۔ مجھے لاکھوں تعریفی خطوط آتے ہیں۔ دوشیزائیں میرے نام کے وظیفے پڑھتی ہیں۔ سوسائٹی گرلز میرے نام کو اپنے لمبے لمبے حسین ناخنوں پر کندہ کرتی ہیں ——— ایک اور خاکہ آنکھوں کے سامنے گھوم گیا ——— سمندر کے کنارے ایک سفید موٹر کار میں مَیں بیٹھا ہوں۔ دنیائے فلم کی حسین ترین اداکارہ برابر کی سیٹ پر بیٹھی میری دلجوئی کر رہی ہے۔ میرا خیال تھا کہ رام ناتھ بھی ایسے ہی سنہری خوابوں کی تخلیق کر رہا ہوگا۔ وقتِ عمل خاموشی کتنے رنگین سپنوں کو جنم دیتی ہے مجھے اس کا

احساس ہو رہا تھا۔

ہم بمبئی پہنچ گئے۔ میرین ڈرائیو۔ ورلی۔ اندھیری۔ محمد علی روڈ۔ دادر۔ ہومنگا ہارنبی روڈ۔ فوارہ سب ہمارے قدموں تلے سے نکل گئے ——— مگر فلم کمپنی کی نوکری ——— خدا ملنا سہل ہے مگر فلم کمپنی کی نوکری ———۔ توبہ بہت مشکل ہے ———۔ اسٹوڈیو کے پھاٹکوں پر کابلی دربانوں کی نوکیلی مونچھیں ——— ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا جذبات کی دنیا میں بھونچال پیدا کر دیتا تھا ——— اسی زمانے میں ایک ایرانی ہوٹل میں میں نے ایک اخبار میں اپنی فوٹو دیکھی۔ فوٹو کے نیچے لکھا تھا "تم لوگ گھر آجاؤ۔ میں بہت پریشان ہوں۔ میں اب تمہیں کبھی کچھ نہ کہونگا"۔ "تمہارا مدھوسودن"۔ رام ناتھ نے قہقہہ لگایا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی چھلکی اور میرے دامن پر دھبے پڑ گئے۔ میری نگاہوں میں بھیا کی معصوم اور مغموم شکل گھوم گئی۔ مگر اس شکل پر مکاری کے نقوش تھے۔

پریشانیاں بڑھ رہی تھیں اور پونجی گھٹ رہی تھی۔ میرے اور رام ناتھ کے پاس کل جمع مبلغ چالیس روپیہ چہرہ شاہی رہ گئے۔ ہم نے سوچا اب گھر لوٹ جانے ہی میں بہتری ہے۔ فٹ پاتھ پر سوتے سوتے پیٹھ تختہ ہو گئی تھی۔ اگر خدانخواستہ کوئی بیماری ہو گئی تو پردیس میں سو رگباشش ہونا پڑے گا۔ کارپوریشن کی لاری شیواجی پارک والے مرگھٹ میں لے جا کر پھینک دے گی۔ اور مرنے میں بھی مزا نہیں آئیگا۔ مگر جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔ استاد رام ناتھ کی دوڑ دھوپ کبھی رائیگاں جا سکتی ہے۔ آخر ایک شام کو رام ناتھ نے یہ کہہ کر دلکش بنا دیا

کہ ورلی والی چال کے شمبھو دادا کی بدولت چال میں ایک کمرہ اور فلم کمپنی میں ایکسٹرا کی جگہ مل گئی ہے۔ بکھرے ہوئے سپنے سمٹ گئے۔ ٹوٹی ہوئی امیدیں بندھ گئیں۔ اجڑے ہوئے گلشن کو پیغام بہار مل گیا۔

لاحول ولاقوۃ یہ بھی دنیائے فلم کس بلا کا گھونسہ اس دن چھاتی پر پڑا ہے۔ جس دن دادا نے بتایا کہ راجوری مجھ سے عمر میں سولہ سال بڑی ہے۔ خیر اب رومان کا نہیں پیٹ کا سوال تھا۔ یہی کاغذ کی بغیر چھت کی جھونپڑیاں پردے پر عالیشان عمارتیں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ بوڑھے گنجے ہیرو کو کیمرہ کیا بنا دیتا ہے ایک ایکٹر ــــــ سو مزدور مرتے ہیں تو ایکٹر پیدا ہوتا ہے۔ اور ایکٹروں میں پھر ایکسٹرا فلمی سرمایہ داروں کے بیدام غلام ان کی ذات سے لاکھوں روپے کا انکم ٹیکس وہ موٹے موٹے کوتاہ گردن سیٹھ بچائے جاتے ہیں۔ تنخواہ ملتی ہے ڈیڑھ روپیہ روز رسید دینی پڑتی ہے پانچ روپے روز کی۔ شمبھو دادا ــــــ وہ ایکسٹرا سپلائیر اس ڈیڑھ روپے میں سے اڑا لیتا ہے چار آنے اسٹوڈیو میں ڈائرکٹر کیمرہ مین ہیرو ہیروئین کو چائے پلانے کا معزز فرض دے تو ایکسٹرا ــــــ ڈائرکٹر صاحب کے گھر کا سودا سلف لائے تو ایکسٹرا۔ ہیروئین کا سامان موٹر سے اتارے تو ایکسٹرا۔ ــــــ انسانی شکل میں دو پاؤں کی بھیڑیں ــــــ ایک دن رام ناتھ نے کچھ ایکٹنگ اپنی طرف سے کرنے کی کوشش کی۔ ڈائرکٹر کا وہ طمانچہ منہ پر پڑا کہ روح بھنا کر رہ گئی۔ وہ رام ناتھ جس نے باپ کے کبھی تیور نہ جھیلے تھے آج پردیس میں گنجے ڈائرکٹر کے جوتے کھا رہا تھا۔ فلمی دنیا کے حضور دو معصوم بھٹکی ہوئی روحوں کی اور قربانی دے دی گئی تھی۔ نائی دھوبی چوبدار کی ایکٹنگ کرنے کا فخر ہم کو ملتا تھا۔

وہ بھی لاکھ خوشامد کرنے کے بعد۔

ایک دن رام ناتھ نے بہت سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا ”لو بیٹا ترلوکی! اب روپے کی فکر نہ رہی“۔ میں خاموش لیٹا رہا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر واقعی اس دن کے بعد سے رام ناتھ آٹھ آٹھ دس دس روپے روز گھر لانے لگا۔ اب بھلا ہم بالا گھاٹ کے کھوٹے کو کیوں نہ نوازتے اور ایکسٹرا کے خون میں حرارت قائم رکھنے کے لئے شراب تو ضروری ہے ہی۔

کوئی جیئے کوئی مرے کوئی ایکٹر بنے کوئی ڈائرکٹر۔ کوئی قید ہو کوئی آزاد بھلا دنیا کے کام کبھی چوک سکتے ہیں۔ —— رام ناتھ جوئے میں قید ہو گیا —— میں اتنی بڑی دنیا میں اکیلا رہ گیا۔ مگر معلوم ہوتا تھا کہ رام ناتھ کی موجودگی میری تقدیر کی راہ میں روڑا اٹکا رہی تھی۔ چنانچہ اس حادثے کے دو چار دن بعد ہی مجھے ڈائرکٹر نے کچھ حوصلہ دیا۔ ”ترلوکی! اگلی تصویر میں تمہیں اچھا سا پارٹ دینگے ——“

تقدیر کی دیوی نے مسکرانا شروع کر دیا تھا۔ اس کے تبسم کی دلآویز شعاعیں دفعتاً کی اوٹ سے نور برسا رہی تھیں۔ ایک دن شوٹنگ ہو رہی تھی۔ میں Baby Spot کی بھاری روشنی لئے کھڑا تھا۔ ڈائرکٹر صاحب کیمرہ مین کے سر پر سوار تھے۔ وہ لائٹ اینڈ شیڈ Effect of light & shade پیدا کرنا چاہتے تھے۔ سین تھا کہ بھوس کے ڈھیر پر ہیروئین لیٹی ہے اور ہیرو صاحب اظہارِ محبت فرما رہے ہیں۔

ڈائرکٹر چیخا light on

اسٹوڈیو بقعۂ نور بن گیا۔

ڈائرکٹر چیخا Fans off

پنکھے بند ہو گئے۔

ڈائرکٹر چیخا Sound

لاؤڈ سپیکر نے دہرایا OK

ڈائرکٹر چیخا Start

ساز چھڑ گئے اور شوٹنگ شروع ہو گئی۔

ڈائرکٹر چیخا Cut

شوٹنگ بند ہو گئی۔ ——— ڈائرکٹر بڑبڑایا "اس ہیرو ماسٹر چند کو دیکھو۔ فیلڈ سے آؤٹ جاتا ہے اور وہ ہیروئین کیسے بے جان بے حس لیٹی ہے ——— محبت بھی نہیں کرنے آتی نالائقوں کو ——— زندہ لاشیں ——— بدتمیز ——— ہیروئین نے ہیرو کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ملامت تھی ———

ہیرو اپنی جگہ سے آگے بڑھا۔ وہ ڈائرکٹر کے قریب آیا۔ "چٹاخ" بڑے زور کا طمانچہ پڑا تھا ڈائرکٹر صاحب کے منہ پر ——— میں نے لائٹ زمین پر رکھ کر ایک چٹکی دی ہے۔ جو ہیرو صاحب کو توسوٹ پر سے بھوسں کے تنکے جھاڑتے نظر آنے لگے۔

ڈائرکٹر صاحب نے مجھے ایک اہم پارٹ دے دیا۔ اب نئی دادا بھی مجھ سے دینے لگا۔ وہ ایکسٹرا اسپلا شر دادا ——— جس روز مجھے پارٹ دیا گیا تھا۔

اسی شام میں نے ساری رات بالاگھاٹ کے بالاخانے پر بسر کی۔ اور صبح اٹھا تو میرے بازوؤں میں گلٹیاں نکل آئی تھیں۔ میں نے آئینہ دیکھا۔ ہونٹوں پر آبلے پڑے ہوئے تھے ——— کتنا خوفناک مرض! ڈاکٹر نے

گویا پگھلا ہوا فولاد میرے کانوں میں انڈیل دیا۔

میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا پونجی ختم ہو چکی تھی۔ چال والے مجھے چال سے نکال کر کہیں مہلک امراض کے کسی ہسپتال میں بھیج دینے کی تجویزیں کر رہے تھے پھر میری سمجھ میں آیا کہ مفلسوں کیلئے ہی بمبئی میں خدا نے سمندر بنایا ہے ــــــ

میرے جسم سے بہتے ہوئے مواد کی بدبو سے میرا اپنا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ میں نے سوچا۔ بھیا نے کتنا اچھا انتقام لیا ہے ــــــ میں نے ان کے ایک گھونسہ مارا انہوں نے خاموشی اختیار کر کے میرے لئے جہنم کے دروازے کھول دئے۔ وہ اخباروں میں فوٹو دنیا کا منہ بند کر دینے کا ڈھکوسلہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں تباہ ہو جاؤں برباد ہو جاؤں۔ میں ان کی راہ کا کانٹا تھا۔ ــــــ انہوں نے کس خوبصورتی سے اس کانٹے کو نکال پھینکا ہے۔ بدمعاش اب سب جائداد کا وارث بن بیٹھے گا۔" تحت الشعور کے دھندلکوں پر شعلے ناچ رہے تھے ــــــ نیلے شعلے ــــــ ان کی نیلی شعاعیں انتقام کو ہم آغوش کر رہی تھیں۔ ان کی چنگاریاں جسم سے مواد بن کر بہ رہی تھیں۔ ــــــ خدا ایک دفعہ مجھے صحت عطا کر دے۔ ایسے کمینے سے ــــــ " ایسی ہی جنون پرور خیالات دماغ میں رینگنے لگے ــــــ مرض خطرے کی حد تک بڑھ گیا۔

میں دروازے کی طرف مایوس نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اسی دروازے سے رام ناتھ دل لگی ہی دل لگی میں دل گیا گاتا ہوا داخل ہوتا تھا۔ اور آج خدا جانے وہ کس جیل میں چکی پیس رہا ہے۔ اس کے بھاری قدموں کی آوازیں دور سے پہچان لیتا ہوں۔

بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں اٹھ بیٹھا۔ شاید رام ناتھ جیل سے چھوٹ گیا تھا۔ —— دروازہ کھلا بھیا کمرے میں داخل ہوئے۔ —— وہ کچھ ٹھٹکے اور پھر بے اختیار مجھ سے لپٹ گئے —— میں خاموش تھا۔۔ وہ کہہ رہے تھے "ترلوکی! یہ تمہیں کیا ہو گیا —— ایک دفعہ کہو کہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ خواب ہے" میرے خیالات کو جھٹکا لگا۔ میں نے سوچا "مکار کیا بہانے بنا رہا ہے۔ میری اس حالت کا ذمہ دار یہی ذلیل ہے ——" اور میں نے ایک طمانچہ بھیا کے منہ پہ دے مارا۔ اس بار وہ مسکرا پڑے —— معصومیت ان کے چہرے کی بلائیں لے رہی تھی۔ وہ بولے "میں اسی قابل ہوں کہ میرے منہ پر طمانچے مارے جائیں —— تمہاری یہ حالت ہو گئی اور مجھے کچھ بھی پتہ نہ چلا ترلوکی —— ایک طمانچہ میرے منہ پر اور مارو —— اور مارو ——" میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ احساسات کے دھندلکوں میں جگنو ناچنے لگے۔

میری تیمارداری میں بھیا نے دن رات ایک کر دیا۔ میں اچھا ہو گیا مگر اس موذی مرض نے بھیا کو دبوچ لیا —— بھیا کے حلق میں سوراخ ہو گیا اور ان کا سارا جسم گویا تندور کی طرح زہریلے شعلے اگلنے لگا۔

بھیا کہہ رہے تھے "ترلوکی! میرے مرتے ہی تم بمبئی چھوڑ دینا۔ یہ بڑی بری جگہ ہے۔ نہیں نہیں یہ اچھی جگہ ہے۔ میں نے یہاں اپنے کھوئے ہوئے بھائی کو پایا ہے —— ترلوکی! پتا ماتا کے مرنے کے بعد میں نے سوچا تھا کہ میرا ترلوکی انجنیئر بنے گا۔ ولایت جائے گا۔ اس کا بیاہ ہوگا۔ چاند سی دلہن گھر آئیگی ——

میں تمہارے بچوں کو لے کر باد ار جایا کرونگا ــــــ مگر خواب غلط بھی تو ہو جاتے ہیں ۔ اس میں تمہارا کیا قصور ہے ــــــ قصور تو میرا ہے کہ میں نے سختی سے کام لیا ۔ میں تمہیں سمجھ نہ سکا ۔ ــــــ کاش! میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کرتا ــــــ ترلوکی! مجھے معاف کرنا ــــــ میری کوتاہ اندیشی نے تمہاری زندگی کو برباد کیا ۔"

میں نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا ۔"بھیا! تم نے مجھے کیوں بچا لیا ــــــ"
بھیا نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا "ترلوکی رونے کے لئے زندگی پڑی ہے ــــــ میرے سامنے مت رو ترلوکی میں تمہیں مسکراتا ہوا دیکھنے کی خواہش لے کر آیا تھا۔"
میں نے کہا ۔"بھیا اب میں مسکرا نہ سکونگا ۔"

بھیا نے کہا "کیوں نہیں ۔ ــــــ کیوں نہیں ترلوکی ــــــ ہاں وہ بھجو لگی داس کی لڑکی رکمنی تمہارا انتظار کر رہی ہے ۔ پگلے وہ تم سے خاموش محبت کرتی تھی ــــــ وہ اب تک تمہارے انتظار میں کنواری بیٹھی ہے ــــــ"
میں چیخا "بھیا!" بھیا بولے ۔"ہاں ترلوکی میں دیکھا کرتا تھا کہ یہ لڑکی میرے ترلوکی کی دلہن بن سکتی ہے ۔ ورنہ مجھے اس سے کیا غرض تھی ۔ ــــــ وہ تمہاری غلط فہمی تھی ــــــ کوئی اپنی لڑکی کو بھی بُری نگاہ سے دیکھتا ہے؟"

بھیا دُور جا رہے تھے ۔ اور میری نگاہوں میں بمبئی کا ایک ایک اسٹوڈیو ظلمات کے سمندر میں گرتا اور گم ہوتا چلا جا رہا تھا ــــــ اس ظلمت کی چھاتی پر ایک شعلہ بھڑکا ایک چتا جل اٹھی ــــــ کیمرے ــــــ لائٹس ــــــ سٹ ــــــ ساؤنڈ ٹرک کا ایندھن اس چتا میں بھسم ہونے لگا ۔ اور اسی ایندھن میں جلنے لگا میرا شعور اور میرا رام ناتھ ۔

چناروں کی اوٹ میں

ننھّی ننھّی پتیّوں والے لمبے لمبے سفیدے کے درختوں کی پرچھائیوں میں ——
مورپنکھیوں سے گھری ہوئی مہندی کی روشوں کے پیچ و خم میں —— نسرین اور
نیلوفر کی لہروں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے وہ سفید سی کوٹھی اسی کی تھی۔ سویرے
سویرے جب سورج کی دوشیزہ کرنیں آبِ زر سے اس کوٹھی کے اونچے اونچے کلسوں
کو غسل کراتیں تو کلیاں گھونگھٹ اٹھا کر مسکرانے لگتیں —— کوئلیں کوکنے لگتیں
—— پرندے چہچہانے لگتے —— مورپنکھیوں کی چوٹیاں تھرکنے لگتیں ——
شمشادوں کی نازک نازک ٹہنیاں وجد میں آجاتیں اور اس ٹھرے سے حوض کی لہریں
گویا منقیش کے نقرئی ستاروں والے دوپٹے جھٹک کر اٹھکھیلیاں کرنے لگتیں۔
اور صبح صبح وہ جب کوٹھی سے نکل کر سرخ روشوں پر سیر کرتی تو گلاب اس کی نازک
انگلیوں کو مس کرنے کے لئے گردنیں اٹھا اٹھا کر اپنے ہونٹ آگے بڑھا دیتے۔ چمیلی کی
کلیاں اس کے مخملی قدموں کے اعزاز میں روشوں کے ننھے ننھے سنگ ریزوں پر اپنی
نرم و نازک پنکھڑیاں بچھا دیتیں —— سبزے کے کلیجے میں آرزوؤں کی

کپکپاہٹ ہلکی ہلکی لہروں کی شکل میں لہرا اٹھتی۔ بنفشہ سر جھکا کر اپنے نیلگوں پھولوں کو پتیوں کی سبز طشتری میں آراستہ کر کے اس کے آگے بڑھا دیتا۔ اشوکوں کے گھنے گھنے سایے مسکرانے لگتے

اور جب وہ اس بڑے سے حوض کی مرمریں سیڑھیوں پر بیٹھ کر لہروں میں پاؤں ڈالتی تو سُرخ سُرخ مچھلیاں موجوں کو گدگدا دیتیں۔ اور جب اس حوض کے نیلے پانی سے اپنے جمال کی گواہی لینے کی تمنّا اس کی مے فروش نگاہوں میں تیرتی تو لہریں ساکت ہو جاتیں۔ سُرخ سُرخ مچھلیوں پر جمود طاری ہو جاتا اور ایک سہ رنگی سا سایہ اس نیلے پانی کی سطح سے ڈگمگاتا ہوا ابھرنے لگتا

آج وہ بہت خوش تھی۔

ایک مدت ہوئی وہ فطرت کے ان ہوش رُبا مناظر سے اکتا چکی تھی ——

وہی جانے پہچانے نظارے —— روز روز وہی سورج اور اس سورج کی وہی طلائی شعاعیں۔ —— وہی کلیوں کا چٹکنا —— وہی پرندوں کا چہچہانا —— وہی سفید کوٹھی —— اس کوٹھی میں وہی قالین —— وہی صوفہ سیٹ —— وہی ریڈیو گرام —— وہی مرمریں زینے —— وہی تنہائی اور اس تنہائی کے وہی سرمئی سائے —— زندگی کی رنگینی نئے نئے ماحول اور تازہ بتازہ واقعات کی رو میں بہ کر مسکراتی ہے۔ مگر وہاں تو وہی لامتناہی سکون تھا —— ایک ایسا سکون جو اس کی نازک روح پر اب بارِ گراں ثابت ہونے لگا تھا —— اس کا بھائی امریکہ میں تھا۔ ماں پرلوک سدھار چکی تھی۔ اور والد راؤ صاحب ترمل کمار ریکسر لاتعداد کارخانوں کے حصّوں سے آنے والے روپوں

کے سہارے اس کنجِ عزلت میں بیٹھ کر اب فلسفہ کی موٹی موٹی کتابوں میں غرق رہتے تھے۔

مگر آج وہ خوش تھی ——— صبح صبح اُس نے دیکھا تھا کہ کوٹھی کے پیچھے والے کوارٹر کے سامنے جو پیپل کا درخت تھا۔ اس پر بید سے بنی ہوئی رسّی والے جھولے پر اس کے باپ کا نوجوان کلرک جیونؔ اپنی نئی بیوی کو بٹھا کر دھیرے دھیرے پینگیں دے رہا تھا۔ پینگیں دیتے دیتے اس نے مولسری کے چند پھول توڑ کر اپنی بیوی کے جُوڑے میں ٹانک دئیے تھے اور اس کی بیوی نے نگاہیں جھکا کر اپنا نازک سر جیونؔ کے سینے پر رکھ دیا تھا۔ اور جیسے ہی ان دونوں کو یہ علم ہوا۔ کہ کوئی نازک سی رُوح ان کے اس رومان کو دیکھ رہی ہے۔ تو وہ بُری طرح کوارٹر کے اندر بھاگ گئے تھے ——— جلدی میں جوڑے کا پھُول دلہن کے مہندی لگے ننھے ننھے قدموں تلے مسلا گیا تھا۔ اور اس روز تمام دن وہ محسوس کرتی رہی کہ جیون اس کے سامنے نگاہیں نہیں اٹھا سکا ہے۔

اور پھر اسی شام کو جب چاند کی بکھری ہوئی شعاعیں چناروں کی پتیوں سے بچھتیں ——— شمشادوں کے سُرخ سُرخ سینوں میں پیوست ہو رہی تھیں وہ کتنی ہی دیر تک جیونؔ اور اس کی بیوی کے بارے میں سوچتی رہی تھی اور سوچتے سوچتے اس کے ننھے سے دل میں ایک لرزتی ہوئی آرزو کی مدھم سی کرن تیر گئی تھی کاش! کوئی اس کے جوڑے میں بھی مولسریوں کے پھول ٹانک کر اُسے دھیرے دھیرے پینگیں دے اور وہ مدہوش نغموں کے پروں کے سہارے ستاروں سے آگے پرواز کرتی جائے۔ نہیں خیالات کو اپنے تخیّل کی دُنیا میں بسا کر وہ خوابوں کے جزیروں میں

داخل ہوگئی ـــــــ تبسم ریز سپنے اسے لوریاں دینے لگے۔

اگلے دن صبح صبح وہ وہیں آ کھڑی ہوئی ـــــــ جہاں سے اُس نے اس معصوم جوڑے کا رومان دیکھا تھا۔ وہاں جھولا بھی تھا ـــــــ مولسریوں کے پھول بھی تھے ـــــــ مگر جیون اور جیون کے دل کی تمنّا نہ جانے کہاں تھے ـــــــ وہ اداس ہوگئی۔ صحرا میں کسی آگ کے پھول پر کپکپاتی ہوئی شبنم کی طرح اُداس ـــــــ

اور پھر ایک رات جب رات رانی آہستہ آہستہ مشک بیز سانسوں سے ماحول کو معطر کر رہی تھی۔ جب سدا بہار کی بیل چاند کی کرنوں کو اپنی تازہ کونپلوں کی آغوش میں بھینچ بھینچ کر پیار کر رہی تھی۔ جب اس بڑے سے حوض میں ننھی ننھی سرخ مچھلیاں نیلی موجوں کے سینے سے چمٹ کر سو چکی تھیں۔ وہ اٹھی اور آہستہ آہستہ کوارٹر کے پیچھے پہنچ گئی۔ جس کی کھڑکی کی ایک دراز سے بجلی کے نیلے بلب کی روشنی اُبل رہی تھی اور جس کے پیچھے جیون اور جیون کی مرکزِ نگاہ رازِ دنیا نہ کی حلاوتوں میں محو تھے۔ اُس نے سُنا جیون اسی کے بارے میں باتیں کر رہا ہے ـــــــ وہ کہہ رہا ہے۔ للتا دیوی بہت اچھی ہیں۔ اگر وہ یہاں نہ ہوتیں تو میں ہکسر صاحب کے یہاں دو دن بھی ملازمت نہ کرتا ـــــــ اتنی تنخواہ نہیں ملتی ہے۔ جتنا انعام دے دیتی ہیں۔

اس کا نازک کلیجہ دھڑکنے لگا ـــــــ للتا کے بیضوی چہرے کو برقی قمقمے کی نیلی شعاعوں نے کتنا دلآویز بنا دیا تھا ـــــــ اس کے لب گلابوں کی نرم نرم پنکھڑیوں کی طرح تھے اور وہ بولی "اُس دن انہوں نے مجھے جھولے پر جھولتے دیکھ لیا۔ مارے شرم کے میرا تو کلیجہ منہ کو آنے لگا ـــــــ وہ مسکرانے لگی تھیں نا!"

جیون نے اس کی نازک کلائی پکڑ کر اسے پلنگ پر اپنے قریب بٹھا لیا اور بولا "للتا! اس میں شرمانے کی کیا بات تھی ——— دنیا دیوی کو بھی تو معلوم ہے۔ کہ ایک دن ایسا آئے گا۔ جب کوئی انہیں بھی اسی طرح دل کے جھولے پر بٹھا کر جذبات کی ہلکی ہلکی پینگیں دیگا ——— تمناؤں کے نشیلے پھولوں سے اُن کے جوڑے کو آراستہ کرے گا۔"

للتا بولی "مگر آپ بھی تو اندر بھاگ آئے تھے!"

جیون نے کہا "تمہیں بھاگتا دیکھ کر میں بھی بھاگ کھڑا ہوا۔"

للت کے لبوں کو تبسم نے چوم لیا۔ وہ بولی "بڑے بہادر ہیں آپ"

جیون للت کے طنز سے مسحور سا ہوا تھا۔ وہ جذبات کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا "یہ بات نہیں ہے للت! کبھی دیکھا ہے جب چاند کی چاندنی ایک الھڑ ندار میں چاند کی آغوش سے اچھل کر دنیا کی طرف بھاگتی ہے تو چاند کو جانتا ہے کہ صبح سے پہلے پہلے اس کی چاندنی پھر اس کے پاس واپس آجائے گی۔ مگر پھر بھی وہ شعور کی دلیلیں بھول کر فرقت کی جنوں خیز رو میں بہ جاتا ہے۔ وہ اپنی چاندنی کی عارضی جدائی میں نیلے آکاش کے ہر کونے کی طرف بھاگتا ہے۔ حتیٰ کہ صبح سے پہلے پہلے اس کی چاندنی سمٹ کر پھر اس کی آغوش میں آجاتی ہے ———"

دنیا کے دل کے تاروں کو دھڑکن کی مضراب آہستہ آہستہ چھیڑ رہی تھی۔ للت نے اپنا سر جیون کے سینے پر رکھ دیا۔ وہ بولی "کیا سچ مچ آپ مجھے اتنا پیار کرتے ہیں؟"

جیون نے قدرے شرارت سے کہا تھا "ایک معمولی کلرک پیار جیسی بلند چیزوں

کو نہیں سمجھتا"۔

للت نے کہا تھا۔ "مذاق چھوڑ دیجئے ۔ ـــــــ جیسی باتیں آپ کر رہے تھے۔ ویسی ہی کیجئے۔"

اور وینا بھی تو یہی چاہتی تھی۔ کہ جیون للت سے ویسی ہی باتیں کرتا رہے۔ مگر جیون کا رومان اب مزاج کی روشوں پر چلنا چاہتا تھا۔

اور وینا جذبات کی دنیا میں ہلچل۔ تمناؤں کے عالم میں طغیانی اور احساسات کے جہان میں خلش لیکر جس وقت واپس لوٹی۔ جھولے والے پیپل کی نرم نرم ٹہنیوں نے طلائی لاکھ کے سرد سرد ریزے اس کی راہ میں بچھا دئے ـــــــ گلابوں نے شبنم کے موتی لٹا دئے ـــــــ اور پھر ایک دن وینا سے للت کا تعارف ہوا ـــــــ دونوں یک جان دو قالب ہو گئیں۔

آہستہ آہستہ للتا اور جیون کے رومان نے وینا کے جذبات کو سوچ بچار کی طرف مائل کر دیا۔ دوشیزگی کا الھڑپن سنجیدگی کی نقاب اوڑھنے لگا۔

اور اس دن جیون نے دیکھا کہ للتا کی بیماری کی خبر سنتے ہی وینا کی نازک پلکوں پر موتی ڈگمگانے لگے تھے۔ اس نے جیون کو للتا کے علاج معالجے کے لئے سو روپیہ کا نوٹ دیا ـــــــ جیون کے دل نے تشکر کا اظہار دو آنسوؤں میں ملبوس کر کے وینا کے قدموں پر رکھ دیا ـــــــ مگر دو گھنٹے بعد ہی جیون سر جھکائے وینا کو روپیہ واپس کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "دیوی جی! للتا نے روپیہ رکھنے سے انکار کر دیا ہے"۔

وینا نے پوچھا۔ "کیوں؟"

جیون نے کہا "وہ بڑی ضدی ہے۔ کہتی ہے آپ نے پہلے ہی ہم لوگوں پر اتنے زیادہ احسان کئے ہیں جن کا بدلہ ہم سات جنموں تک نہیں چکا سکتے" کہتے کہتے جیون کا گلا رندھ گیا۔

وینا کے لہجے میں چھاگلوں کی جھنکاریں تھیں جب وہ بولی "جیون! اس میں احسان کی کیا بات ہے؟ آخر انسان ہی انسان کے کام آتا ہے ——— جب للتا اچھی ہو جائے گی تم یہ روپیہ واپس کر دینا"

اور اس رات وینا نے کھڑکی کے پیچھے سے سنا "للتا کہہ رہی تھی۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ کسی کا احسان اٹھائیں"

جیون نے کہا تھا "للتا! تم یہ تو سمجھنے کی کوشش کرو۔ کہ تمہارے لبوں کا تبسم ہی میری آرزوؤں کا شباب ہے۔ کتنے دن ہو گئے ہیں تمہیں مسکرائے۔ وینا دیوی تو سورگ کی آتما ہیں۔ میں تمہیں تندرست دیکھنے کے لئے کمینے سے کمینے انسان کا احسان اٹھانے کے لئے تیار ہوں" ——— للتا آبدیدہ ہو گئی۔ اس نے رک رک کر کہا "ناتھ! جب میں یہ دیکھتی ہوں کہ آپ کے دل کو بھگوان نے کتنی نیکی دی ہے۔ کتنا خلوص دیا ہے۔ آپ کتنے اچھے ہیں۔ آپ مجھے کتنا پیار کرتے ہیں۔ تو میں بھی چاہتی ہوں کہ اپنی جان ——— اپنا دل اور اپنا ایمان آپ کے قدموں کی خاک پر نچھاور کر دوں ——— آپ دیوتا ہیں ناتھ! اور میں آپ کی دیوداسی ہوں۔ دیوداسی بھلا کب چاہے گی کہ اس کے دیوتا اس کی وجہ سے کسی کے بھی آگے ہاتھ پھیلائیں"

للتا کی آنکھوں کے موتیوں کی داد دینے کے لئے جیون کی پلکوں پر بھی ستارے

ڈگمگانے لگے تھے۔ وہ رُندھے ہوئے گلے سے بولا "للتا میں تمہارے دل کو ٹھوکھانا نہیں چاہتا۔ یقین رکھو۔ یہ سو روپیہ میں ہر ماہ اپنی تنخواہ میں سے کٹوا دونگا"

للتا کو کھانسی کا دورہ پڑا۔

اور پیپل کی طلائی لاکھ سے بھی زیادہ سرد ——— موتی برساتی ہوئی وینا گھر واپس لوٹی۔

اگلے دن اس نے جیون کو گفتگو کرنے کا موقع ہی نہ دیا ——— وہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ جیون کہنا چاہتا ہے کہ وہ اپنی تنخواہ میں سے ہر ماہ کچھ رقم کٹوا کر یہ سو روپیہ پورا کر دے گا۔ مگر اس نے جیون کو یہ تذکرہ چھیڑنے ہی نہ دیا۔

اور پھر ایک دن وینا بھیرو ی کی مدھر راگنی کی طرح لہک اٹھی ———

وہ خوش تھی بہت خوش۔ جیون کی پکار کو رحمتوں نے لبیک کہا تھا۔ اس کی سہیلی رو بہ صحت ہو گئی تھی ——— وہ وینا کو ملنے اس کے یہاں آئی تھی۔

للتا کی آوازیں احسان مندی اور شکر گزاری کی ملی جلی جھلکیاں تھیں۔ وہ بولی "وینا جی! آپ سچ مچ دیوی ہیں۔ اگر آپ جیسے فرشتے بھگوان نہ بنائے تو دنیا کیے جہنم میں غریبوں کے لئے سوائے خونخوار شعلوں کے اور کیا ہے"

موتیوں کی لڑیاں یاقوت کی چلمنوں میں جھلملا اٹھیں۔ جب وینا نے کہا۔

"پگلی بیمار ہو کر سب کو پریشان کر دیا ———"

للتا نے کہا "آپ کو بھگوان نے کتنا سندر دل دیا ہے"

شوخیاں لوٹ پوٹ ہو گئیں جب وینا نے پوچھا "اور تمہیں؟"

للتا نے سر جھکا کر جواب دیا "میرے پاس تو اب نہ اچھا دل ہے نہ برا۔ ..

جیسا بھی تھا میں تو ان کے قدموں پہ نثار کر چکی ہوں۔"

نہ جانے دینا نے کیسے پوچھ لیا۔" اور اگر وہ تمہارا دل ٹھکرا دیں"؟

للتا کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ بولی۔" آپ دیوی ہیں، ایسا نہ کہیئے ——

آپ کی یہ بات کہیں سچ نہ ہو جائے۔ دل ٹھوکر کھانے کے بعد ٹوٹ جایا کرتا ہے۔

اور پھر دل کے بغیر انسان کہیں زندہ رہتا ہے"؟

دینا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ بولی۔" پگلی کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ کبھی جیون تیرا دل ٹھکرا سکتا ہے۔ وہ تو تیرا پجاری ہے۔"

للتا کے پوچھنے میں معصومیت کی حلاوت تھی۔" آپ کا پجاری کہاں ہے"؟

دینا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کے یاقوتی لب تھر تھرا اٹھے۔ اس کی نگاہوں میں لمحہ بھر کے لئے سرخ ڈورے لہرا گئے —— اور وہ خاموش ہی رہی۔

للتا نے شرارت سے پوچھا۔" میں نے کچھ پوچھا ہے دیوی جی!"

اس بار وہ بولی۔" مجھے کیا معلوم ——"

اور دونوں کے قہقہے فضاؤں کی خوشبوؤں میں تحلیل ہو گئے۔

اور پھر دینا —— للتا اور جیون کے مصنوعی جھگڑوں میں ثالث بننے لگی —— اس کے فیصلے اکثر للتا ہی کے حق میں ہوتے تھے۔

ادھر نرمل کمار کا فلسفہ کا مطالعہ کم ہوتا جا رہا تھا —— کارخانوں کے حصہ جات کا روپیہ بہت تیزی سے بڑھ رہا تھا —— انہیں کہاں تو سال میں ایک یا دو اور کہاں اب ایک ہفتہ میں تین تین کمپنیوں کی میٹنگوں میں

شریک ہونا پڑتا تھا ــــــــ کام بہت بڑھ گیا تھا ــــــــ جیون دن رات حساب کے موٹے موٹے رجسٹروں میں غرق رہتا ــــــــ وہ گئی رات تک دفتر میں سر جھکائے کوئی نہ کوئی کام کرتا ہی رہتا۔

ایک دن للتا نے اچانک وینا کے کمرے میں آتے ہوئے کہا "میں کچھ کہنا چاہتی ہوں"۔

وینا چونک اٹھی۔ وہ صوفہ کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی۔ "اِدھر آؤ"۔

للتا اپنی جگہ پر ہی کھڑی بولی "میں نے تین دن سے کھانا نہیں کھایا ہے ــــــــ"

وینا نے حیرت میں آتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں"؟

للتا کی آواز میں بے بسی تھی۔ "وہ صبح صرف ناشتہ ہی کر کے یہاں آجاتے ہیں۔ پھر دن بھر گھر نہیں آتے۔ آدھی رات کے بعد آتے ہیں اور بغیر کچھ کہے سُنے لیٹ جاتے ہیں"۔

وینا نے اُسے ڈھارس دیتے ہوئے کہا۔ "تم یہاں بیٹھو میں ابھی جیون کو بلاتی ہوں"۔

للتا صوفے پر بیٹھ گئی۔

چند لمحات کے بعد جیون حاضر تھا۔

وینا کے لہجے میں تحکم کا انداز تھا۔ جب اُس نے کہا۔ "تمہاری شکایت آئی ہے جیون!"

جیون کی آواز میں حوض کی لہروں کی ٹھنڈک تھی۔ "کیا"؟

دینا نے کہا "تم دن بھر کچھ نہیں کھاتے اور گئی رات بنا کچھ کھائے جا کر سو رہتے ہو"

جیون کے لہجے میں وہی سرد مہری تھی "جی"۔

دینا نے پوچھا "کیوں"؟

جیون نے کہا "اب تو یہ خواہ مخواہ پریشان ہوتی ہیں ——— کوٹھی میں سالہا سال تک چین کی بنسی بجائی ہے۔ اب کچھ کام آیا ہے تو ان کا خیال ہے۔ میں اب بھی آرام کرتا رہوں"۔

للتا کے لہجے میں یاس آمیز بے چارگی تھی "مگر میں نے یہ کب کہا ہے۔ کہ آپ کام نہ کریں۔ مجھے تو اس کا گلہ ہے کہ آپ کچھ کھاتے ہی نہیں۔ آیسے کب تک تن درستی چلے گی"۔

جیون للتا سے رجوع ہوتے ہوئے بولا "کھانے کا نہیں آپ کو اس بات کا گلہ ہے کہ میں یہاں سے جانے کے بعد آپ کے پاس بیٹھ کر گپیں نہیں ہانکتا۔ آپ کو کہانیاں نہیں سناتا ——— تو بہ ——— مجھے بھی اپنی تن درستی کا خیال ہے۔ میں نے سالہا سال تک ہکسر صاحب کا نمک کھایا ہے"۔

دینا نے دیکھا۔ للتا کے رخساروں پر آب نقرہ کی لکیریں کھنچ گئی تھیں۔

وہ بولی "جیون! تم جاؤ میں پتاجی سے کہونگی"۔

جیون چلا گیا۔

اسی شام دینا نے کھڑکی کے پیچھے سے سنا۔ جیون کہہ رہا تھا "للتا! نہ جانے تمہاری سمجھ کو کیا ہو گیا ہے۔ تم شکایتیں لے کر دینا دیوی کے پاس جا پہنچیں۔

وہ کیا سوچ رہی ہوں گی۔ میں کتنا وحشی ہوں جو اپنی بیوی کا خیال تک نہیں رکھتا۔"

للتا کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ وہ بولی۔" تو میں کیا کرتی۔ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا کہ آپ بغیر کچھ کھائے پئے یوں اپنی صحت کو تباہ کریں!"

جیون نے للتا کی گفتگو سے اکتاتے ہوئے کہا۔" یہ رونا بند کرو۔ خدا جانے ہر عورت کا یہ خیال کیوں ہوتا ہے کہ وہ مرد اور مرد کی تمام کائنات آنکھوں کے چند حقیر آنسوؤں میں بہا سکتی ہے۔"

دینا جذبات میں ہانپتی اور پلکوں پر نمی لئے ہوئے جس وقت واپس لوٹی ــــــــ چاند شبنم کے آنسو رو رہا تھا۔ گلابوں نے رخسار پیٹ پیٹ کر سرخ کر لئے تھے۔ کلیوں نے گریبان پھاڑ لئے تھے۔ اور پیپل کی نرم کونپلوں کے ماتھے کا پسینہ طلائی لاکھ بن کر ٹپک رہا تھا۔

اور گویا یہ اطلاع بھی دینی تھی ایسے میں جیون نے دینا کو مطلع کیا۔ کہ للتا تین دن سے بیمار ہے۔

دینا نے للتا کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہی محسوس کیا کہ وہ تمام کی طرح جل رہا ہے۔ للتا بڑبڑائی ــــــ" دینا دیوی! آپ دیوی ہیں۔ آپ میرے دکھ درد ٹال سکتی ہیں۔ مجھے میرے پتاجی کے ہاں بھجوا دیجئے۔"

دینا نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔" تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی للتا!"

للتا کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر اس کے آویزوں میں اُلجھ گئے۔ وہ بولی۔ "دیوی جی! میں دیکھ رہی ہوں کہ کام ان کی جان نکالے جا رہا ہے۔ ان کا چہرہ

آدھا رہ گیا ہے۔ ان کی بھوک ختم ہو گئی ہے۔ میں پتا جی کے گھر چلی جاؤں گی۔ تو وہاں یہ سب کچھ تو نہ دیکھ سکوں گی۔ اس بیچ میں کام ہلکا ہو جائیگا اور میں بھی وہاں جاکر اچھی ہو جاؤں گی۔ میرے میکے کی آب و ہوا بہت اچھی ہے دیوی جی!"

دینا نے کہا "سنا تو ہے کہ تمہارا میکہ کلو میں ہے اور وہاں کی آب و ہوا بہت اچھی ہے۔"

بیمار للتا نے کراہتے ہوئے گویا خواب سا لیا "بہت اچھا ہے میرا میکہ دیوی جی! وہاں بہاریں سیبوں کے رخساروں پر سرخیاں بن کر جاگر ہوتی ہیں۔ مستیاں انگوروں کا رس بن کر ٹپکتی ہیں۔ کیف نگتروں کے رس میں تحلیل ہو کر ملتا ہے۔ وہاں روز صبح صبح سورج کی کرنیں برف آلودہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر پھسل پھسل کر کھیلتی ہیں۔ وہاں گدیوں کے قافلے بانسری کے سُروں کی جھنکار میں بلند ترین منزلوں کی طرف رواں رہتے ہیں۔ وہاں ننھے ننھے آبشار جلترنگ کے سُروں پر ناچتے ہیں۔ وہاں قدرت ہنستی ہے اور فطرت جھومتی ہے۔"

دینا نے محض اتنا کہا "اچھا! اب تم خاموش ہو جاؤ۔ ورنہ حرارت بڑھ جائے گی!"

مگر للتا اپنے بخار کی حدت کو اپنے میکے کی دلکشی کی یاد سے مٹا دینا چاہتی تھی۔ وہ بولی "اور نہیں آبشاروں میں، ایک آبشار کے کنارے جب انہوں نے یہ کہا تھا "للت! تمہاری آنکھوں میں میری آرزوؤں کی چلبلاہٹیں ہیں میں بنفشہ کے آسمانی پھولوں میں منہ چھپا کر ہنس پڑی تھی اور وہ گنگنانے لگ پڑے تھے"۔

"تینوں نے کہا تینوں نے سنا - اب تم بولو یا نہ بولو"

اور وینا جب تمناؤں کی بستی میں ٹمٹماتے ہوئے چراغ لے کر واپس لوٹی ہے۔ تو شفق کی دلہن سرخ لبادہ پہن کر ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری آرتی اتارنے کے لیے ودا ہو چکی تھی۔

بہت دنوں تک نہ للتا نے اس سے کچھ کہا - اور نہ جیون نے معلوم ہوتا تھا گویا کوئی طوفان کسی خاموشی کے نقاب کے پیچھے جنم لے رہا ہے۔ وہ جب للتا کے پاس جاتی تو اس کو خاموش پاتی اور خاموش چھوڑ آتی ــــــ وہ جب جیون سے کچھ پوچھتی جیون چپ ہی رہتا۔

ایک دن جیون نے بتایا "آج للتا کلو جا رہی ہے۔ میری چھٹی پر اس کے چچا اس کو لینے آئے ہیں"۔

شام کو جب شفق کی دلہن سورج کی آرتی اتارنے کے بعد خود جوہر رچا رہی تھی للتا وینا سے وداع ہوتے ہوتے رو سی پڑی "میں جا رہی ہوں۔ انہوں نے میرے دل کو ٹھکرا دیا ہے دیوی جی! اب میں نہ جی سکونگی۔ آپ ان کو صحت کا خیال رکھنے کے لئے کہیئے گا ــــــ"

اس سے آگے اس کے جذبات کا اظہار اس کی آنکھوں نے ہچکیوں کے اوراق پر آنسوؤں سے لکھ کر کیا تھا

وینا نے اسے ہر قسم کی تسلی دیتے ہوئے کہا تھا "مگر جیون کہاں ہے؟"
للتا نے صرف اتنا جواب دیا تھا۔ "وہ شاید مریضِ غم کی آخری حالت دیکھنا پسند نہ کر کے کہیں چلے گئے ہیں"۔

للتا چلی گئی ——— نامراد و ناکام ——— کبھی لوٹ کر نہ آنے کا ڈراؤنا خواب اپنے نازک دل میں سمیٹ کر۔

اور ایک رات جب چاند اپنی کرنوں کو چندر مکھی کے سر پر نچھاور کر رہا تھا۔ رات رانی کا تبسّم لطیف خوشبو بن کر فضاؤں میں تحلیل ہو رہا تھا۔ چناروں کی نرم کونپلیں رجا رہیں جھوم رہی تھیں۔ سفیدے کے لمبے لمبے سائے تھرک رہے تھے۔ حوض کا نیلگوں پانی ہلکی ہلکی لہروں کی تاروں پر نیلم کلیان کا مدھر گیت گا رہا تھا ——— جیون نے وینا کو تار دیتے ہوئے کہا "للتا مر گئی ہے"۔

وینا پر سکتہ کا دورہ پڑا۔ اُس نے پوچھا "کب ؟"

جیون کا جواب تھا "کل"

کچھ دیر کے لئے دونوں خاموش ہو گئے۔

جیون پھر خود ہی بولا "تپ دِق کا علاج دُنیا میں کہیں نہیں ہے"

وینا خاموش رہی۔

اور دُور ——— بہت دُور ——— کلّو کی غلک بوس پہاڑیوں کی آغوش میں ندی کے کنارے جب للتا کی چتا بھڑک بھڑک کر خاموش ہو چلی تھی ——— وینا کی پلکوں پر آنسو آ گئے۔ وہ بولی "کتنے اِنتظار کی زحمتوں کے بعد خدا نے جیون تمہیں میرا بنا لیا ہے"۔ اور یہ کہہ کر اُس نے جیون کے سینہ پر اپنا سر رکھ دیا۔

جیون کی انگلیاں وینا کے گیسوؤں میں اُلجھ گئیں۔ پرند چہچہا اُٹھے۔ چاند کی شعاعیں حوض کی لہروں سے کھیلنے لگیں۔ رات رانی نے خوشبوؤں کی

جھولیاں اُلٹ دیں۔ اور دُور جہاں پیپل کی ننھی ننھی ٹہنیاں سبزے پر طلائی لاکھ کے قطرے چھڑک رہی تھیں۔ وہاں چناروں کی اوٹ میں جھولا اب بھی پڑا تھا۔

سمادھ

"عجب زمانہ ہوگا وہ بھی بابو جی آجکل بھی انسان کے پاس انسان کو تباہ کرنے کے لئے قسم قسم کے ہتھیار موجود ہیں اور اس زمانے میں بھی تھے جب سے دُنیا بنی ہے دوستی اور دشمنی کندھے سے کندھا ملائے ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ وہ سامنے بھٹیارن کا محل تو آپ دیکھ چکے۔ یہ دیکھئے کنیا کی سمادھ۔ یہ اس محل سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ ہزاروں سال پُرانی"

گائیڈ نے اپنی گول گول سُرخ پتلیوں والی آنکھیں گھماتے ہوئے کہا

"اس کھنڈر کی ایک ایک اینٹ خستہ ہو چکی ہے۔ بالکل اس کنیا کے ارمانوں کی طرح جو کھلنے سے پہلے ہی مُرجھا گئے تھے۔ کسی کو کیا معلوم کہ اس مرجھائی ہوئی دھرتی کے سینے پر بکھرے ہوئے اس سوکھے ملبہ کے نیچے کتنی مجروح آہیں بھی سر دھن رہی ہونگی۔ اور اسی طرح سر دھنتی رہیں گی۔ تاوقتیکہ چاند کے ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہو جاتے۔ سورج پارہ پارہ ہو کر سمندر میں نہیں گر پڑتا۔ بڑے بڑے پہاڑ بنیادوں سے ہل کر غرقِ آب نہیں ہو جاتے۔ ہر طرف جل تھل نہیں ہو جاتا۔ اور سنسار میں مہا پرلے

(قیامت، نہیں آجاتی ——"

وجے نے دیکھا تھا کہ تارا کچھ سہم سی گئی ہے اور گائیڈ نے وجے کی پلکوں پر تھرکتے ہوئے سوال کو اپناتے ہوئے کہا۔

"بابوجی یہ سمادھ ایک کنیا کی ہے۔ کوئی زمانہ تھا —— اور بڑا عجیب زمانہ ہوگا بابوجی! جب ہندوستان بڑی بڑی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ دماغ پر دل کا دبدبہ تھا۔ سیاست بھی، وشنا وپر تلوار کی نوک اور انسان کے خون سے لکھی جاتی تھی —— اس وقت سڑکوں اور نہروں کے جال نہیں بلکہ جاسوسوں کے جال بچھے ہوئے تھے۔ رات کی سیاہی میں لاکھوں چیخیں بلند ہوتی تھیں اور سیاہی میں ہی گم ہو جاتی تھیں۔ صبح کے دھندلکے اُن کے رازوں تک پر پردے ڈال دیتے تھے۔ ماحول میں سرگوشیاں رقص کرتی رہتی تھیں۔ ہر طرف سازشیں پنپتیں۔ رنگ لائیں اور پھر نئی سازشوں میں اُجاگر ہوتی رہتیں"!

وجے گیبرڈین کے نرگسی سوٹ میں اپنی جارجٹ میں ملفوف محبوبہ کے ہمراہ اس کھنڈر میں، قدیم تہذیب کے سینہ پر جدید تمدن کے طنز کی طرح کھڑا تھا اور گائیڈ —— وہ تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اسی کھنڈر کے کسی ویران کونے سے کوئی جھریوں والا انسان۔ پھٹا ہوا لبادہ الجھی ہوئی پگڑی پہن کر اٹھ کھڑا ہوا تھا ایک کرخت سا حلقہ قدیم اور جدید تہذیبوں کے درمیان جو زندہ رہنے کے لئے ہزار ہا سال پرانے واقعات کے ہجوم میں سے نکل کر کچھ دیر کے لئے آجکل کی دُنیا میں دم لینے کے لئے آگیا ہو۔

وجے نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور دھوئیں کا بادل اُگل دیا۔ وہ خلائ

معمول سنجیدہ تھا۔ اسے کھنڈر کی اس اجڑی ہوئی دُنیا میں کسی عظمت کی سسکتی ہوئی رُوح کا احساس ہو رہا تھا۔ اور وہ احساس آہستہ آہستہ سمٹ کر اس کی نگاہوں کو۔ وقت اور مقام کی قیود سے آگے نکل جانے کی دعوت دینے لگا تھا۔

گائیڈ نے چیختے ہوئے کلس پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "کُسمبھی اور دنشہ دو ریاستیں۔ موریہ خاندان کی بکھری ہوئی مردہ سلطنت میں سے اُبھر آئیں۔ کُسمبھی کے مہاراج شیل داہن اور دنشہ کے چندر کیتو ——— ایک درخت کی دو شاخیں تھیں۔ مگر درخت مرجھا کر گر چکا تھا۔ اس کی جڑیں جہیں شعلوں کا ایندھن بن چکی تھیں اور نرم نرم کونپلیں گرد و غبار کے ساتھ اڑ کر خاک ہو گئی تھیں۔ اور یہ دو شاخیں رہ گئی تھیں ایک دوسرے کا نام تک دُنیا سے مٹا دینے کے لئے۔ گورو دیودشنوگپت چانکیہ کی سیاسی چالوں سے دونوں ہی واقف تھے اور دونوں ہی کو اس کا فخر تھا۔ کہ ان کے بزرگ چندر گپت کو بھی چانکیہ کی عقیدت بھگوان نے عطا کی تھی۔ دونوں کی دشمنی نے کتنی ہی بار لوہے سے لوہا بجوا دیا۔ کتنے ہی ساونتوں نے دھرتی کے ماتھے پر اپنے لہو سے تلک لگایا۔ مگر بابوجی! جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا شیل داہن اور چندر کیتو کی دشمنی شمشان کی لپٹوں کی طرح بڑھتی ہی جاتی تھی ———"

دجے کا تصور اسی اثناء میں تخیل کی محرابوں سے نکل کر ماضی کے اندھیرے ایوانوں میں ایک سوئی کی شمع روشن کر چکا تھا ——— وہ دیکھ رہا تھا۔ اپنے والد کے پڑوسی لالہ شیو کمار کو۔ کوتاہ گردن۔ پست قد۔ بڑی سی توند۔ چھوٹی سی عمر میں ہی بیش تر دانت گر چکے تھے۔ اور جو باقی بچ گئے تھے۔ وہ پان کی پیک سے شریف کے بیجوں کی مانند کالے پڑ چلے تھے ——— اس کو فخر تھا اپنی اونچی ذات پر۔ اور اس کو ناز

تھا اپنے راجپوتی خون پر۔ کتنی بار دونوں میں تُو تُو مَیں مَیں کی نوبت آ چکی تھی ——— جیسے جیسے وقت گذرتا جاتا تھا دونوں کی دشمنی پروان چڑھتی جاتی تھی

گائیڈ نے کہا ——— "نہ جانے دونوں کس لوہے کے بنے تھے کہ آپس میں ٹکراتے تھے۔ جھنکار تو بلند ہوتی تھی۔ مگر مجال کیا جو ایک دوسرے کا حوصلہ رتی بھر بھی پست ہو ——— دونوں اُدھیڑ ہو چلے تھے ——— دونوں ہی لاولد تھے بابو جی! بھگوان کو شیل واہن پر ترس آیا۔ اور ایک ننھے سے معصوم چاند نے اندھیرے راج محلوں میں اطمینان اور امید کی سہمی شماعیں چھڑک دیں۔ چندر کیتو کی آتشِ عداوت اور بھڑکی شیل واہن کے قبیلے کے لئے ننھا سا راجکمار چاند ہو سکتا تھا۔ مگر چندر کیتو کے لئے تو وہ ایک چنگاری تھا۔ جو جوان ہونے کے بعد اس کی ریاست کو کسی وقت بھی تباہ و برباد کر کے اپنی حکومت میں شامل کر سکتا تھا ——— ———"

اور وجے نے تصور کی نگاہوں سے دیکھا کہ اس کی ماں اسے لوریاں دے دے کر سلا رہی ہے۔ اچانک اس کے نرم نرم رخساروں پر ماں کی آنکھوں سے گرم گرم آنسوؤں کے دو قطرے گرے اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اپنی ننھی سی اطلسی رضائی ایک طرف پھینکتے ہوئے بولا ——— "ماں تم کیوں لوتی ہو۔ تم کو پتا جی نے مالا ہے"؟

کوئی بھی جواب دینے کی بجائے اس کی ماں نے اس کا منہ چوم لیا اور اس کے سنہری بالوں میں انگلیاں الجھا کر بولی "نہیں بیٹا! کسی نے نہیں مارا۔ تم چپکے سے سو جاؤ۔ اس طرح رضائی نہیں پھینکا کرتے ہیں۔ سردی لگ جاتی ہے"۔ اس نے

اصرار کیا۔ "نہیں ماں بتاؤ مجھیں کسی نے مارا ہے۔ میں اس کو ماروں گا"

اس کی ماں کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں ——— معصومیت دانائی کی یوں پرستش کر رہی تھی۔ کہ فرشتے بھی اس کے بھولے پن کی بلائیں لیں۔ پھر وہ تو ماں کا کلیجہ تھا۔ بھلا کیوں نہ امڈ آتا ——— وہ رک رک کر بولی۔ بیٹا! تمہیں کیا معلوم کتنی منتوں اور آرزوؤں کے بعد بھگوان نے مجھے تمہارا منہ دکھایا ہے اس لالہ شیو کمار کی عورت بانجھ ہے۔ جس دن سے تم پیٹ میں آئے تھے اس نے جادو ٹونے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ معلوم نہیں اس کو تم سے کس جنم کا بیر ہے پھر اس نے پوچھا تھا "تم کیوں دکھی ہو"

اس کی ماں اس کے پیہم سوالات سے جھلا اٹھی تھی ——— وہ بولی تھی۔ "اچھا تم سو جاؤ مجھے ابھی تمہارے پتاجی کی چائے کا بندوبست کرنا ہے!" اور وہ اتنا کہہ کر رہ گیا تھا ——— "اچھے بچے رات کو جلدی سو جاتے ہیں نا ماں"!

اور گاہ بگاہ کہہ رہا تھا ——— "باوجی! ارا یکبار بڑا ہونے لگا ——— غنچہ دہن کھولنے لگا پھول بننے کے لئے۔ طفلی کے قہقہے سنجیدگی میں ڈھلنے لگے ——

اور اسی بیچ میں بھگوان نے چندر کیتو کو کنیا کا دان دے دیا ——— کئی بار مہاراج کے دل میں آتا تھا کہ وہ کنیا کا گلا دبا دے ——— وہ سوچتے تھے کہ اس لڑکی کی وجہ سے کوئی ان کا داماد بنے گا۔ اور پھر وہ پگڑی جو آج تک کسی کے آگے نہ جھکی تھی۔ سب سامنے کسی چھوکرے کے آگے جھک جائے گی۔ مگر مہارانی کے پیہم اصرار کنیا کی حفاظت کر رہے تھے ———"

اور اچانک وجے کو یاد آیا کہ وہ جب بارہ سال کا تھا سیٹھ شنو کمار کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی تھی اور سیٹھ جی نے یک لخت بھگوان شنو کی پوجا بند کردی تھی

گائیڈ کہہ رہا تھا۔ عمر۔ دانائی اور بے وقوفی یہ اتنی خاموشی سے آگے بڑھتے ہیں کہ کچھ پتہ نہیں چلتا ــــــ راجکمار اور راج کنیا جوانی کے ایوانوں میں داخل ہو چکے تھے۔ مگر اس زمانے میں کسمبھی اور وتسشہ کے لوگوں پر حیرت کا ایک عظیم وار ہوا۔ کسی کو یقین نہ آتا تھا ــــــ مگر تھی حقیقت ــــــ چندر کیتو اور شیل داہن کی دوستی ہو گئی تھی۔ اب تو چندر کیتو کے یہاں سے شیل داہن کو تحفے آئے تھے۔ اور شیل داہن کے یہاں سے چندر کیتو کو۔ کہاں تو اتنی دشمنی تھی کہ ایک دوسرے کا نام تک نہ سن سکتے تھے اور کہاں اتنی دوستی ہوئی۔ کہ اب ایک دوسرے کے بغیر یہ دونوں زندہ نہیں رہ سکتے تھے ــــــ کسمبھی کے وزیر اعظم مہاپنڈت ہرشل اس دوستی کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے۔ مہاراج چندر گپت اگر چانکیہ بن جاتے تو موریہ خاندان کا ناش ہو جاتا ــــــ مہاراج کبھی مہامنتری نہیں بن سکتے۔ مہامنتری صرف برہمن ہی بن سکتا ہے۔ اور راج صرف کھشتری کر سکتا ہے۔ اگر یہ دونوں ایک دوسرے کا فرض سنبھالنے کی کوشش کریں تو یقیناً نظام حکومت درہم برہم ہو جائے گا۔" مہاراج شیل داہن نے پُروقار لہجہ میں کہا "یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے" مہامنتری کے لہجے میں خلوص کے ہمراہ بے باکی بھی تھی۔ اس نے جواب دیا ــــــ حکمرانوں کی ذات کبھی امور سلطنت کے دامن سے الگ نہیں ہوتی مہاراج! اور

پھر بغیر موسم کا پھل۔ بنا رت کی بارش بے وقت دوستی اور بے مطلب دشمنی ہمیشہ نقصان ہی دیتے ہیں۔ فایدہ کبھی نہیں دیتے"۔ مہامنتری چیختا رہا۔ مگر تقدیر کے ناخنوں نے تدبیر کی دھجیاں اڑانی تھیں اڑا دیں۔ بابو جی شیل داہن اور چندر کیتو یک قالب و دو جان ہو گئے"۔

اور وجے کو یاد آ رہا تھا ——— ماں اس دن کتنا جھنجلائی تھیں جب انہیں یہ معلوم ہوا تھا کہ لالہ ستو کمار مردانے میں بیٹھے ٹھاکر صاحب کے ساتھ چائے پی رہے تھے اور لالہ جی اپنی ابھری ہوئی گردن کا پسینہ اپنی دھوتی سے پونچھتے ہوئے کہہ رہے تھے "ٹھاکر صاحب! ہماری آپ کی دشمنی ہی کس بات کی۔ آپ ٹھہرے راجہ آدمی۔ اور میں ایک غریب بیوپاری ——— اور ٹھاکر صاحب نے مونچھوں پر تاؤ دیا تھا۔ اور لالہ جی کی خوشامد خوری پر لگ گئے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے "کبھی پڑوسیوں میں بھی لڑائی ہو سکتی ہے۔ پڑوسی کا دھرم تو سگے بھائی کے دھرم سے بھی زیادہ اونچا اور زیادہ مشکل ہے۔ مجھے تو صرف اس بات کا گلہ تھا کہ آپ ہر وقت سیر و شکار میں پڑے رہتے ہیں اب بھگوان نے بچہ دیا ہے ——— کچھ اس کے لئے اور کما کر رکھ جائیں۔ ہمیں کمانے کی بدھ آتی ہے۔ کچھ ہم سے سیکھ لیں ———"

اور ٹھاکر صاحب کہہ رہے تھے "ہاں۔ کوئی چھوٹی موٹی تجارت کرا دو تو دو پیسے ہی کما لیں"۔ چند ہی دنوں کے بعد سیٹھ جی کے طفیل سے ٹھاکر صاحب نے سٹہ کا بیوپار شروع کر دیا۔ انہیں سیٹھ جی کی دانشمندی پر تعجب ہو رہا تھا۔ آج تک جتنے بھی چانس بتائے سب ہی سچ ہوئے۔ انہیں اپنے اوپر

افسوس ہو رہا تھا۔ کاش! وہ سیٹھ جی سے پہلے ہی دوستی کر لیتے
گائیڈ کہہ رہا تھا ـــــــــ "ایک دن بابو جی! راجکمار شکار کھیلنے گئے۔
بھیگتی ہوئی مسیں سرخ و سفید رنگ۔ گھونگرالے بال۔ ریشمی انگرکھا۔ چست
پائجامہ۔ سرخ نیمیا مبر۔ یاقوتوں سے مرصّع ننھا سا مکٹ مخملی کمان۔ شنگرفی رنگ
کا ترکش۔ جواہرات سے مرصّع نیام والی ننھی سی خم دار تلوار۔ راجکمار چنچل سفید
گھوڑی پر یوں آراستہ تھے جیسے وسنت کے موسم میں کامدیو خود رتی کو ـــــ
ڈھونڈنے نکلے ہوں
ایک کالے ہرن کا پیچھا کرتے کرتے وتشہ کی حدود میں آ نکلے۔ نیزہ بردار پیامبروں
نے مہاراج چندر کیتو کو اطلاع دی۔ کہ کشمبھی کے ولی عہد ان کی حدود میں جلوہ افروز
ہیں۔ وہ اشنان دھیان چھوڑ کر راجکمار کو لینے کے لئے خود پالکی میں بیٹھ کر راجکمار
کو راج محلوں میں لینے کے لیے چل پڑے
بابو جی! راجکمار محلوں میں آئے ـــــــ مرمری جالیوں کے پیچھے
سے راجکماری نے راجکمار کو دیکھا ـــــــ پہلے نگاہیں جھکیں
پھر اوپر اٹھیں۔ پھر جھکیں اور پھر دبی دبی پلکوں کی اوٹ سے راجکمار کو
دیکھتی ہی رہ گئیں۔

دوسرے دن راجکمار کو مہاراج چندر کیتو الوداع کہہ رہے تھے۔ اچانک
راجکمار کی نگاہ اٹاری پر گئی اور وہیں کی ہو کر رہ گئی ـــــــ نہیں تعجب
ہوا کہ صبح ہو چکی ہے۔ سورج نکل آیا ہے۔ مگر مہاراج چندر کیتو کے راج محلوں
پر پورنماشی کا چاند ابھی تک جوں کا توں اپنی چاندنی بکھیر رہا ہے۔ چندر کیتو کی

تجربہ کار نظریں سب کچھ تاڑ گئیں ۔ ــــــ ان میں ایک روشنی سی آئی۔ اور پھر گہرائی پیدا ہو گئی ـــــــ اور وہ پھر آہستہ سے بولے۔" راجکمار! ہمارے اور شیل واہن کے تعلقات سالہا سال بگڑے رہے ہیں ـــــــ اور پھر وقت نے اس دشمنی کو دُنیا کی بہترین دوستی میں تبدیل کر دیا ـــــــ کیوں ـــــــ یہ صرف وقت ہی بہتر جانتا ہے ـــــــ وقت کا انتظار بڑے بڑے سوالوں کو حل کر دیتا ہے

اور بابو جی! راجکمار نئے نئے سپنوں کا سنسار بسا تا اپنی راجدھانی کو واپس لوٹ آیا ـــــــ صدہا سیمیں کرنوں سے بنا ہُوا ایک لطیف سنسار جہاں نغمے تیرتے ہیں۔ خوشبوئیں رقص کرتی ہیں اور نرم نازک پنڈلیوں میں ـــــــ تھرکتی ہوئی چھاگلیں دِلوں کے جذبات میں چٹکیاں بھرتی ہیں

راجکمار کے وہ لب جو ہمیشہ کیف و انبساط کے نغمے گنگنایا کرتے تھے۔ اب ایک غیر معین وقت کے انتظار میں آہیں بکھیرنے لگے۔ جوانی کو دل کی ایک میٹھی میٹھی ٹیس نے اور جاذب نظر بنا دیا۔ راجکمار کے سُرخ و سفید چہرے پر اب بشاشت اور بیچراہٹ کی ایک ہلکی ہلکی افسردگی تھی۔ گویا چاندنی میں ایک آدھ کھلے کنول پر کسی ہلکے سے بادل کا سایہ اس کو اور بھی خوبصورت بنا دیتا ہے ـــــــ مگر بابو جی! آپ نے کبھی دیکھا ہے۔ خواہ جھومتے ہوئے دل کی سریلی تان ہو یا مغموم کلیجہ کی شعلہ بار آہ ـــــــ نہ جانے کیوں یہ دونوں ہی ختم ہوتی ہیں ایک سسکی پر۔ ـــــــ یہ کھنڈر دیکھ رہے ہیں نا آپ ـــــــ کسی عظمت کا المیہ اختتام ہیں۔ ریگستان کے سیمیں ذرات کو اپنی حدت سے پھونک کر طلائی

ریزے بنا دینے والا سورج ۔آپ روز دیکھتے ہی ہیں ۔شفق کی چتا پر دو لمحات ہی میں جل کر ظلمات شب کی آغوش میں گم ہو جاتا ہے ۔بہاروں کا شباب خزاں کے ہاتھوں یوں اجڑتا ہے کہ گرد و غبار کا طوفان بن کر رہ جاتا ہے ۔چاند کی کرنیں شبنم کے آنسو بن کر روز ہی تو غنچوں کی آغوش میں سسکتی ہیں ۔اور پھر خاک میں مل جاتی ہیں ۔ مہاراج شیل واہن بیمار ہوئے اور سرگباش ہو گئے ——"

تارا کے منہ سے آہ نکلی اور وہ چپ ہو گیا" کہہ کر پھر اپنی یکسوئی کی دنیا میں گم ہو گیا ۔اسے یاد آیا ۔کہ ٹھاکر صاحب کو عیار سیٹھ نے اپنی راہ پر لگا لیا ۔چار دن چاندنی کے آئے اور پھر اندھیر اچھانے لگا —— اس کی ماں کے زیورات آہستہ آہستہ سیٹھانی جی کی زیبائش کرنے لگے ۔مکان تک رہن ہو گیا سیٹھ کا انتقام نہایت خوفناک تھا ۔اور نہ جانے اور کیا سے کیا ہو جاتا ۔اگر سیٹھ حرکت قلب بند ہو جانے سے پرلوک نہ سدھار جاتا —— مگر ان باتوں کے باوجود —— کیتنی حسین تھی وہ شام جب سیٹھ جی اور ٹھاکر صاحب کی دوستی کے دنوں میں وہ اپنے پتا جی کے ہمراہ اور سیٹھ جی اپنی سپتری کے ساتھ سینما دیکھنے گئے تھے ۔اور سینما دیکھتے دیکھتے اچانک اس کا ہاتھ سیٹھ جی کی لڑکی کے ہاتھ سے چھو گیا ۔اور اس کے تمام جسم میں ایک بجلی سی دوڑ گئی ۔اور پھر دیوالی کے دنوں میں جب وہ سیٹھ جی کے یہاں مٹھائی دینے گیا تھا ۔تو اس نے دیکھا تھا کہ سیٹھ جی کے یہاں قلعی ہو رہی ہے ۔ان کا تمام سامان بکھرا پڑا ہے اور اس بکھرے ہوئے سامان میں سے اچانک ہی ایک

خوبصورت سی ڈائری اس کے ہاتھ لگی ——— اور وہ اس کے اوراق یونہی پلٹ رہا تھا کہ اسے ایک صفحے پر یہ لکھا نظر آیا ——— "آج سینما دیکھتے وقت ان کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھو گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ تمام جسم پانی پانی ہو کر نہ جانے کہاں بہ جانے لگا۔ ایک ہلکی ہلکی کپکپاہٹ۔ ایک میٹھی میٹھی سی خلش تمام بدن میں سوئیاں سی چبھونے لگی ——— بھگوان کتنا اچھا ہے وہ ——— "۔ اور اس نے وہ ڈائری وہیں کی وہیں رکھ دی ——— اور پھر اس نے نہایت ہوشیاری سے پتہ لگایا کہ یہ ڈائری رکھی کہاں جاتی ہے ——— اور پھر وہ وقتاً فوقتاً اپنے تجربوں کا نتیجہ خاموشی سے ڈائری کے اوراق میں پڑھ کر کھسک جاتا

ایک ہلکی ہلکی افسردگی۔ ایک پُرمعنی سنجیدگی نے دونوں کی شخصیت کو اور بھی جاذبِ نظر بنا دیا تھا۔ اور پھر جب اس کے پتا جی کو سیٹھ جی کی عیاری کی وجہ سے گھاٹا پڑنا شروع ہوا ——— دونوں کا ملنا جلنا تک آپس میں بند ہو گیا۔ دونوں کی یہ دعائیں کہ ایک بار پھر ٹھاکر صاحب کو منافع ہونے لگے۔ کسی سنگِ آستاں سے ٹکرا کر ناکامیابی کی چتا میں بھسم ہونے لگیں ———

ادھر گائیڈ گویا ماضی کی خاموش لہروں پر تیرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "مگر بابو جی چندر کیتو نے شیل واہن کے مرنے کے بعد کسمبھی سے تعلقات نہیں توڑ دیئے۔ وہ راجکمار سے اب دوگنی محبت کرنے لگا تھا ——— ایک دن بھرے دربار میں جب راجکمار اپنی بائیں طرف کی خالی کرسی کو یاس آمیز نگاہوں سے تک رہا تھا۔ اس کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا تھا جب وتشنہ کا راج دوت

کہہ رہا تھا۔ "مہاراج! چندر کیتو کی طرف سے میں راجکمار جی کے رشتہ کا پیغام لایا ہوں۔"

مہامنتری بولے۔ "ہم سوچیں گے"۔ راجکمار جواب مہاراج ہو چکا تھا مہامنتری کے اس تاخیر آمیز جواب پر قدرے جھنجلا اٹھا۔ ماتھے کی شکنیں سمٹ گئیں۔ وہ محض اتنا بولا۔۔۔۔۔۔ "مہامنتری"! مہامنتری نے سر جھکا لیا اور پھر دتشہ کے راجدوت کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "ہم کو یہ رشتہ منظور ہے۔ ہمارا پیغام دو۔ کہ جیوتشیوں سے شبھ لگن مقرر کرالیا جائے"!

دربار نوبت اور نفیری کے نغموں سے گونج اٹھا ــــــــ"

وجے کی نگاہوں کے سامنے وہ تمام واقعات گھوم گئے۔ جب لالہ شیو کمار کی وفات کے بعد سیٹھانی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا تھا۔ "ٹھاکر صاحب! یہ لڑکی آپ کی ہے اور آپ ہی نے اب ہماری دیکھ بھال کرنی ہے۔ ــــــ اور اس کے بعد سیٹھانی کی چیخ اور پکار نے محلہ بھر سر پہ اٹھا لیا تھا۔ ٹھاکر صاحب سیٹھ جی کی دشمنی کو بھول گئے ــــــ اور ایک دفعہ پھر دو دلوں کو راز و نیاز کا موقع مل گیا تھا ــــــ

گائیڈ کی زبان میں تیزی اور لہجہ میں سنجیدگی آ رہی تھی ــــــ اس کا ہر لفظ گویا دل کے کسی گنبد میں سے گونجتا ہوا نکل رہا تھا ــــــ وہ کہہ رہا تھا۔ "کینیا کو وداع کرتے وقت چندر کیتو اسے تخلیہ میں لے گیا۔ وہ بولا۔ "بیٹی! راجاؤں کی دنیا میں جذبات پرستی نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ شکتی شکتی اور اکھنڈ شکتی۔ یہی راجاؤں کا آدرش ہوتا ہے ــــــ راجاؤں کے محل کبھی جذبات کے پوپلے تھردں

پر تعبیر نہیں ہوتے ہیں وہ بنتے ہیں ٹھوس واقعات کی بنیادوں پر۔ خواہ ان واقعات میں نوبت اور نفیری کے نغمے پنہاں ہوں یا مظلوموں کی آہیں سسکتی ہوں۔ آج بیٹی میرے خواب پورے ہوئے ہیں۔ تمہاری شادی ہوگئی۔ آج گوردیو چانکیہ کی آتما سورگ میں جھوم رہی ہوگی۔ وہ مجھے ضرور آشیرباد دے رہی ہوگی بیٹی تمہیں پر نہیں ملا ہے دو ریاستوں کا راجیہ ملا ہے" اور اتنا کہتے ہی مہاراج چندر گپت قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ کنیا تذبذب میں پڑ گئی۔ مہاراج پھر بولے۔ گوردیو کے دکھائے ہوئے راستے کے مطابق میں نے تمہیں وش کنیا بنا دیا۔ بچپن ہی سے میں نے تمہیں سنکھیا کھلا دیا ـــــ اسی لئے دیکھتی ہو تمہارا رنگ کتنا سُرخ ہے تمہاری آنکھوں میں کتنی چمک ہے۔ اب تمہاری رگ رگ میں زہر دوڑ رہا ہے۔ سہاگ رات کے بعد تم دو ریاستوں کی واحد رانی بن جاؤ گی۔

کنیا پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ـــــ جس کے دیدار کی انتظار میں اُس نے ایک ایک دن ایک ایک برس کر کے گزارا تھا ـــــ جس سے ملنے کی تمنّا نے ہجر کی پہاڑوں جیسی راتوں کو آج تک اس کے لئے ہموار بنایا تھا۔ کیا کاتبِ تقدیر نے اس کے اپنے ہاتھوں سے اپنے محبوب کو زہر کا پیالہ پلوانا تھا ـــــ کیا نظرِ فریب ساحل ـــــ محض ایک دھوکا تھا۔ جب کہ اصل طوفان کی رات کنارے پر آکر ہی اکٹھی ہوگئی تھی ـــــ

کنیا کا دل ٹوٹ گیا۔ وہ غش کھا کر گر پڑی۔ لوگوں نے کہا" کنیا کا وداع ہونا ایک قیامت سے کم نہیں"۔ پھاگن کی راتیں کتنی حسین ہوتی ہیں۔ انہیں راتوں میں سے ایک رات تھی۔ راج محل کی چھت پر شبِ عروسی کا اہتمام کیا گیا تھا ـــــ

دوج کا چاند آسمان کے ہلکے ہلکے بادلوں کے پیچھے ناممن تدبیر کی طرح کانپ رہا تھا۔ سیارے لرز رہے تھے ——— ہوائیں تھرا رہی تھیں ———

راجکمار نے دیکھا" کنیا کا بیضوی چہرہ ستاروں کی روشنی میں ڈھل کر دو چند حسین بن چکا تھا ——— ابروؤں سے اُتر کر ——— رخساروں تک چھٹکے ہوئے تھم تھم کے سیارے دو سنہری سانپوں کی طرح عارض پہ گویا پھسلے پھسلے جا رہے تھے۔ نہ جانے کس کس کی تمنا میں راجکمار نے دیکھا کہ کنیا کی پلکوں پر آنسو تھرتھرا رہے تھے۔ وہ پیچھے ہٹتا ہوا بولا " مہارانی! کیا تم اس شادی سے خوش نہیں ہو؟ کنیا نے کہا " نہیں "۔ راجکمار دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ بولا ——— " کیوں "؟

کنیا نے کہا " کیونکہ آپ میرے دیوتا ہیں "۔ راجکمار مسکرایا اور بولا " کتنی جذباتی ہو تم "۔ کنیا نے جواب دیا " مہاراج راجاؤں کے دھرم کی بنیادیں پو پہلے جذبات پر نہیں رکھی جاتیں "۔ راجکمار نے کنیا کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا " تم تو پہیلیاں بجھوا رہی ہو "!

کنیا نے کہا " یہ پہیلیاں نہیں ہیں مہاراج ۔ یہ میری زندگی کی وہ گتھیاں ہیں جو سلجھائے نہ سلجھیں "!

راجکمار نے کہا " تمہارا دل دکھی معلوم ہوتا ہے کنیا!

کنیا نے کہا " نہیں مہاراج میں دکھی بھی ہوں اور سکھی بھی "!

راجکمار نے کہا " یعنی ——— " کنیا بیچ میں بول اٹھی " یعنی کیا مہاراج جس دیوتا کے درشن کے لئے راتیں آہوں کی بھٹی میں پھونک دی ہوں اور نئے نئے سوپن

بنا کر توڑے ہوں ——— جس کو اشکوں کا تحفہ چاند کی کرنوں کے ہاتھوں روز رات کو بھیجا ہو ——— وہ دیوتا آج میرا دیوتا بن چکا ہے۔ میں خوش کیوں نہ ہوں"۔

راجکمار نے پوچھا "اور دکھ ———"

کنیا نے اٹکتے اٹکتے کہا "مہاراج! دکھ اس بات کا ہے کہ میں اپنے آپ کو آپ کے قابل نہیں سمجھ رہی ہوں۔ آپ کی شخصیت کے قریب آتے ہی مجھے میری کم مائیگی کا احساس مارے ڈال رہا ہے۔ چکور کو چندرماں کے ملنے کے بعد محسوس ہوتا۔ کہ ایک ادنٰے پرندے کو نور کے پتلے کی قربت کا کوئی حق نہیں"۔ ———

راجکمار کنیا کے پاس آتے ہوئے بولا "تم بہت جذباتی ہو ——— ضرورت سے زیادہ ———"

کنیا بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی ——— "مہاراج! میں شو کو پرنام کر کے آتی ہوں"۔ کنیا چلی گئی۔ چھت کی بارہ دری کے ایک ستون کی آڑ سے نکلتے ہوئے مہامنتری نے کہا "مہاراج نے بتایا تھا۔ مگر مجھے یقین آج آیا ——— راج ماتا آپ کو محبت کرتی ہے مگر وہ وش کنیا ہے ———"

راجکمار کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ بولا "کیا"

مہامنتری ہنسا۔ وہ بولا "گورو دیو چانکیہ نے وش کنیا کے وش اتارنے کا علاج بھی بتایا ہے۔ آپ یہ دوا کھالیں"۔ راجکمار نے بغیر کسی اصرار کے دوا کھا لی۔ مگر بابو جی! تقدیر کی دیوی اپنا زہریلا تیر چھوڑ چکی تھی۔ راج محلوں کے دالان سے شعلہ بھڑکا۔ اور راج کنیا کی سمادھ بن گئی ———"

وجے کی آنکھوں سے یاس کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اور تارا کی آنکھوں سے ستارے ٹوٹ رہے تھے ——— گائیڈ اپنی اجرت لے کر کھنڈر ہی میں کہیں گم ہو چکا تھا۔

وجے نے کہا۔"تارا! معلوم ہوتا ہے"یہ ہمارے جیون کی کہانی ہے"

"تارا نے کوئی جواب نہ دیا

وجے نے اصرار کیا۔"اس دیوی کی سمادھ کے سامنے قسم کھاؤ۔کہ ہم زندگی کے اختتام کو المناک نہیں بننے دینگے ———"

دونوں نے قسم کھائی ———

گھر پہنچتے پہنچتے وجے کی آبدیدہ ماں وجے کے گلے سے لپٹ گئی۔وہ کہہ رہی تھی۔

"وجے! اپنے پتاجی کو بچاؤ ———"

وجے ہکا بکا تھا۔

ماں نے کہا۔"وجے! اسی چڑیل سیٹھانی نے مجھے زہر دے دیا تھا۔نہ معلوم پولیس کو کیسے پتہ لگ گیا۔پولیس آ پہنچی۔سیٹھانی نے اپنے بیان میں کہا ہے۔کہ سیٹھ کو بھی اُس نے زہر دے کر مارا ہے۔اور مجھے بھی زہر اس لئے دینا چاہتی تھی کہ ٹھاکر صاحب اور اس کا راستہ صاف ہو جاتے"!

وجے چیخا۔"ماں"

ماں نے کہا۔ہاں بیٹا۔سیٹھانی نے بیان دیا ہے کہ تارا تمہاری بہن ہے ———

خیر ——— تم اپنے پتاجی کو جیل جانے سے بچاؤ ——— پولیس انہیں پکڑ

کرنے گئی ہے "!

تارا غش کھا کر گر پڑی۔ وجے بولا۔ "تارا مرے یا جئے ———— ماں!
کنیا کی ایک اور سمادھ بن گئی ہے۔ دنیا بھر کی شکتی اپنے ہی ہاتھوں میں سمیٹ
لینے والے اپنے بچوں کے لہو سے ہاتھ رنگ لیتے ہیں۔ کاش! ماں شکتی کے
خود غرض متمنی اتنا تو سمجھ لیں "!

ماں کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔

اور وجے کا گلا رندھ گیا تھا۔

عظیم اللہ

۱۸۵۶ء

انگلستان

مارچ کی ایک پُرکیف دوپہر

برائٹن کا ہنگامہ پرور ساحل

عظیم اللہ مشرق کو جانے والے جہاز کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے طائرِ ادراک نے پر تولے۔ ماضی کے دھندلکوں کو چیر کر کسی کے بھولے بھٹکے یہ الفاظ اس کے احساسات کو چھیڑنے لگے "عظیم جلد واپس آنے کی کوشش کرنا۔ آنکھوں میں دل لے کر میں تمہاری راہ دیکھا کروں گی"۔ یادِ محبوب یاس آفریں تبسّم بن کر عظیم کے لبوں پر منجمد ہو گئی۔ ایک دم اس کے دماغ میں سینکڑوں خیالات آ گئے۔ اُس نے اپنے تخیل کی پرواز سے گھبرا کر ساحل کی طرف دیکھا درجنوں فرنگی دوشیزاؤں کی نگاہیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ اُسے کچھ جھنجلاہٹ سی ہوئی۔ ایک مبہم سا خیال اس کی سطحِ ذہن پر تیر گیا۔ کاش یہ مغرب مشرق کے کردار کو سمجھ سکتا۔ کاش یہ رنگ

برنگی تتلیاں یہ سمجھ سکیتیں کہ جب کوئی ذی حس مشرقی نوجوان کسی عورت کی نگاہوں میں ہوس کی اٹھکیلیاں دیکھتا ہے تو اسے ان نگاہوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ اس نے ان خیالات کو بھی چھوڑنا چاہا ——— آج اس کی طبیعت انگلستان کے ذرہ ذرہ سے بیزار ہو رہی تھی۔ وہ ساحل کے ایک طرف چل پڑا۔ اس ہنگامے سے بچ کر کسی گوشہ عزلت کی تلاش میں۔ عقب سے کسی کی باریک ترنم ریز آواز آئی۔

"ہیلو عظیم اللہ!"

عظیم نے پلٹ کر دیکھا۔ آواز اس کے کانوں کو مانوس معلوم ہوتی تھی۔ اُسے یقین نہ آیا کہ کچھ دور پر ہاتھ میں وینٹی کیس Vanity case لئے سر پہ ہلکا پھلکا کھجور کا ہیٹ لگائے نوعمر حسینہ اس کی طرف بڑھتی چلی آرہی تھی۔

عظیم ——— اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

دوشیزہ نے اس کے قریب آتے ہوئے متبسم لبوں کو رقص آفرین جنبش دی۔

"عظیم! تم انگلینڈ کب آئے؟"

عظیم کے جواب میں ذرا بھی بناوٹ نہ تھی بلکہ ایک وقار تھا۔ جب اس نے نکھری ہوئی انگریزی میں کہا "معاف کیجئے گا۔ محترمہ میں آپ کو پہچان نہیں سکا ہوں!"

دوشیزہ نے جواب دیا "شاید آپ مجھے بھول گئے ہیں۔ پچھلے سال جنوری میں میں اپنے ڈیڈی کے ساتھ برہماورت گئی تھی۔ میرے ڈیڈی پیشوا کے شاہی مہمان تھے۔ وہاں میرا آپ سے تعارف کرایا گیا تھا۔"

عظیم نے اپنے حافظہ پر زور ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے کچھ کچھ خیال تو آرہا ہے شاید میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے آقا حضور نانا صاحب کے یہاں اتنے انگریز مہمان آتے ہیں کہ ان سب کو یاد رکھنا میرے لئے ناممکن ہو جاتا ہے۔"

دوشیزہ کے لہجہ میں کچھ حیا تھی۔ کچھ شوخی تھی۔ جب اس نے کہا۔ "آپ سچ کہتے ہیں۔ مگر جو انسان ایک دفعہ بھی آپ کو دیکھ لیتا ہے وہ تو پھر آپ کو نہیں بھول سکتا۔"

عظیم نے کہا۔ "شکریہ"

دوشیزہ اور عظیم خراماں خراماں ساحل پر ٹہل رہے تھے۔ کچھ تتلیاں ان دونوں کو ہوس و حرص کی نگاہوں سے گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں

دوشیزہ نے پوچھا۔ "آپ کو انگلینڈ پسند آیا؟"

عظیم نے سطحِ بحر پر ایک شہباز کو منڈلاتے ہوئے دیکھ کر جواب دیا۔ "سوداگروں کا ملک ہے۔" ـــــــ پھر وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔ "مہمان نوازی تو مجھے یہاں نہ ملی۔"

دوشیزہ نے دستی کیس کو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔ "کاش! تم یہاں کی دوشیزاؤں کے دل دیکھ سکتے۔ ـــــــ ان کے دلوں میں تمہیں خوش آمدید کہنے کی کتنی تمنائیں بے چین ہیں کاش تم یہ سمجھ سکتے۔"

دوشیزہ بغیر کسی حوصلہ افزائی کے بے تکلف ہوتی جا رہی تھی۔ "آپ" کی جگہ لفظ "تم" نے لے لی تھی۔ مگر عظیم ـــــــ عظیم بے لوث تھا ـــــــ اس کا جواب ہر تکلف سے عاری تھا۔ "ہو سکتا ہے کہ یہاں کی دوشیزاؤں کے دل میری ہوس میں دھڑکتے ہوں۔ مگر محترمہ میں انگلستان میں رومان کی تلاش میں نہیں آیا ہوں۔

اتنا کہتے کہتے اس کا لہجہ اور بھی سنجیدہ ہوگیا۔ وہ بولا "میں یہاں انصاف ڈھونڈنے آیا تھا۔ مجھے انصاف کی لاش تو ملی۔ مگر انصاف نہ مل سکا۔"

دوشیزہ کی آواز میں بھی اب سنجیدگی تھی۔ "ہوسکتا ہے عظیم کہ تمہیں یہاں انصاف نہ مل سکا ہو۔ مگر یہ سیاست ہے ـــــــــ محض سیاست۔ پھر بھی تعجب ہے کہ جب تمہاری نقرئی آواز شاہانہ شخصیت۔ سنگدلی کے لئے بدنام صنفِ نازک کے دلوں میں ہنگامے اور طوفان برپا کرسکتی ہے تو کمپنی کے ڈائرکٹرز کو اپنی جانب کیوں نہ راغب کرسکی؟" عظیم نے قدرے جوش سے کہا "مجھے یہاں کی صنفِ نازک کے دلوں کے ہنگاموں سے کیا لینا۔ میرا تجربہ ہے۔ کمپنی کے ڈائرکٹروں کے پاس وہ کان ہی نہیں جو انصاف کی آواز کو سن سکیں۔ ان سیاست دانوں کے پہلو میں وہ دل ہی نہیں جو رواداری اور محبت سے متاثر ہو سکے۔ یہ لوگ جب چاہیں اپنا مطلب سیدھا کرنے کے لئے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرسکتے ہیں۔"

معلوم ہوتا تھا کہ دوشیزہ عظیم کی صاف گوئی سے گھبرا گئی تھی۔ وہ اس موضوع کو بدل دینا چاہتی تھی۔ اس نے افق پر ایک ہلکی سی بدلی کو مچلتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ "مارچ کی دوپہریں ہندوستان میں اتنی حسین نہیں ہوتی ہیں"۔

عظیم نے جواب دیا "انگلستان میں اکتوبر اور نومبر کے مہینے کتنے وحشتناک ہوتے ہیں۔"

دوشیزہ یک لخت کہہ گئی "کیا ہندوستانی نوجوان کسی مغلوب عورت کے دل کی دھڑکنیں نہیں سُن سکتا" اور اتنا کہتے ہی وہ کچھ شرما گئی۔

عظیم نے کہا "مغرب نمائش چاہتا ہے۔ اور ہندوستان کا نوجوان دل کی دھڑکنوں کو ضبط کی گود میں سوتا ہوا دیکھنا پسند کرتا ہے۔ وہ محبت کے احساسات کو الفاظ کے بوجھل جامے پہنا کر بدنام کرنا نہیں جانتا۔ اس کی الفت کے نغمے سوائے اس کے اپنے دل کے اور کوئی نہیں سُن سکتا۔ وہ ہونٹ تو سی ہی سکتا ہے مگر آنسو بھی پی لیتا ہے"۔

دوشیزہ نے پوچھا "تمہیں اتنی اچھی زبان کہاں سے ملی عظیم"!

عظیم نے جواب دیا "جستجو شرط ہے۔ دُنیا میں کیا نہیں مل جاتا"۔

دوشیزہ چپ ہو رہی۔ کچھ دیر کے بعد اس نے پوچھا "آج رات کو تم میرے ساتھ کھانا کھانا پسند کرو گے"؟

عظیم نے جواب دیا "شکریہ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ مجھے اپنا پتہ دے دیں"۔

دوشیزہ عظیم کو اپنا پتہ دینے کے بعد اس سے رخصت ہو گئی۔ کچھ دور کسی نوعمر لڑکیوں نے اسے گھیر لیا۔ وہ سب اس سے اس ہندوستانی "راجہ" کے بارے میں سوالات پوچھ رہی تھیں۔

رات آ گئی۔

آسمان نیلی طشتری میں مچلتے ہوئے ستاروں کا رومان آفریں تحفہ لئے خاموش اور ساکت تھا۔ چاند کسی گوشہ عزلت میں ابر کی چلمن کے پیچھے چاندنی کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں کر رہا تھا۔ ویسٹ منسٹر کی گھڑی ۹ کا وقت ظاہر کر رہی تھی۔ لندن

کے کاروباری حلقے کبھی کے خاموش ہو چکے تھے۔ ٹمیس کی لہریں قہقہے بھرتی ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ساحل کا بنگلہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ مہمانوں میں زیادہ تعداد عورتوں کی تھی۔ ڈانسنگ ہال میں چینی کے گلدانوں کے قریب کوئی ہسپینی دوشیزہ رمبا کی گت بجانے میں محو تھی۔

سب کی نگاہیں یک لخت دروازہ کی طرف اٹھ گئیں۔

ہلکے نیلے رنگ کی ریشمی کھڑکی دار مخملی پگڑی ہلکے گلابی رنگ کا لمبا انگرکھا۔ کمخواب کا جگمگاتا کمر بند۔ زردوزری کی جوتی۔ پہلو میں جواہرات سے مرصع نیام کی تلوار ——— سرتاپا مجسمۂ حسن و شباب جمال و جلال کا عالم لئے عظیم کھڑا تھا۔

کچھ شوخ نیتریوں نے وینٹی کیس سے آئینے نکال کر دیکھے اور اپنے رخساروں کو پھر سے شرمندۂ غازہ کیا۔ چند دوشیزاؤں نے آنے والے کی شخصیت کا جائزہ ہلکی پھلکی دوربینوں سے لیا۔ کچھ مردوں نے اپنے اپنے کالر ٹھیک کئے۔ رمبا کی گت بجانے والی اسپینی دوشیزہ کی نازک انگلیاں پیانو کے سیاہ پردوں سے سفید پردوں پر پھسلیں اور کانپ کر ساکت ہو گئیں۔ بے ربط نغموں کی جھنکار فضا میں تیرنے لگی

عظیم اللہ کی میزبان آہستہ آہستہ عظیم اللہ کی طرف بڑھی اور اُسے خراماں خراماں ڈانسنگ ہال میں لے آئی۔ اس نے عظیم کا تعارف فرداً فرداً اپنے مہمانوں سے کرایا۔

عظیم کے لبوں پر تبسم رقص کر رہا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش اور

بھی دلآویز ہو گئے تھے۔

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا ——————— اپنی میزبان کے قریب۔ ساحل سے آنے والی تیز ہوا اس کے کمر بند پر ٹنکے ہوئے یاقوت و الماس سے کھیلنے لگی۔ اس کے لباس کے جواہرات کے عکس دیواروں پر رنگ برنگی شعاعیں بن کر ناچ رہے تھے۔

عظیم خوش فہم مجمع پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالنے کے بعد اپنے میزبان سے بولا "آپ کے یہاں کافی چہل پہل ہے"۔

دوشیزہ کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ اس نے بھی مہمانوں پر ایک نظر ڈالی اور اپنی بلوریں گردن کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے کہا "میرے مہمان آپ سے ملنے کے بہت مشتاق تھے"۔

عظیم کے لبوں کو تبسم نے گدگدایا اور موتی کی دو لڑیاں جھلک اٹھیں۔ میزبان مسحور ہو گئی۔ اس کے لہجہ میں ترنم کی کیفیت تھی۔ جب اس نے پوچھا "آپ کچھ پیئں گے"؟

عظیم کچھ سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے جواب دیا "میں شراب نہیں پیتا"۔

دوشیزہ نے عظیم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا "آپ میرے ساتھ ناچیے گا"۔

عظیم کی سنجیدگی بڑھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش کچھ گہرے ہو گئے تھے۔ وہ بولا "مجھے ناچنا نہیں آتا"۔

دوشیزہ مسکرائی۔

ایک مرد مہمان نے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔

عظیم نے گلدان میں سے ایک پھول نکال کر نگاہِ تحسین و آفریں سے دیکھا اور سونگھا۔

دوشیزہ نہ جانے کیسے کہہ گئی "مغربی پھولوں میں خوشبو نہیں ہوتی"

عظیم بول اٹھا "کتنا صحیح فرمایا ہے آپ نے"۔

ایک نوخیز فرنگی دوشیزہ دوڑی دوڑی عظیم کے قریب آکر خاموش کھڑی ہو گئی۔

عظیم نے اس کی طرف استفساریہ نگاہوں سے دیکھا۔

دوشیزہ کے لبوں کو جنبش ہوئی وہ بولی "کیا میں آپ سے یہ پھول لے سکتی ہوں"؟

عظیم نے بغیر جواب دیئے پھول حسینہ کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے انتہائی فخر سے اُسے چُوم کر اپنی فراک میں لگا لیا۔ کتنی ہی نسوانی نگاہوں میں حرص اور حسد کے جذبات کروٹیں لینے لگے۔

میزبان دوشیزہ نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اچھا اب آپ ہم لوگوں کا ناچ دیکھئے۔"

عظیم نے گردن کو ہلکی سی جنبش دی۔

پیانو پر ٹراوٹ Trout کی گت شروع ہوئی۔ نغموں کے زیر و بم تھرکتے ہوئے مختلف قدموں میں ہم آہنگی پیدا کرنے لگے۔ نوجوان حوریں ہال کے چمکدار فرش پر گویا پھسلتی جا رہی تھیں اور عظیم ——

عظیم دیواروں پر آویزاں تصویروں کو دیکھ رہا تھا۔

پیانو کے مدھر سر عطر اور لونڈر سے معطر فضا میں آہستہ آہستہ بے ہوش ہو گئے۔ رقص ختم ہو گیا۔ مہمان دھیرے دھیرے رخصت ہو گئے۔

میزبان دوشیزہ نے بے نیاز عظیم سے نصف انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"آیئے کچھ دیر باہر بنچ پر بیٹھیں"

دونوں باہر آبیٹھے۔

دوشیزہ تاریکی میں بھاگتی ہوئی لہروں کو دیکھ کر بولی "آپ نے آج کچھ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا"

عظیم نے کہا۔ "رات بہت خوب ہے" ——— سمندر سے آنے والی ہوا نے گویا اس کے لہجہ کو سنجیدہ اور آواز کو بھاری بنا دیا تھا۔ وہ بولا۔ "ماحول دلکش تھا۔ فضا عطر بیز تھی ——— ناچ رومان آفریں تھا۔ ——— حوران فرنگ حسین تھیں ——— مگر ———" وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

دوشیزہ نے کہا "ہاں ——— مگر ——— کہیئے آپ رک کیوں گئے"

عظیم نے جواب دیا "ممکن ہے۔ آپ کو ناگوار گزرے ——— ہم ہندوستانی حتی الامکان یہی کوشش کرتے ہیں۔ کہ ہم سے کسی بھی عورت کے دل کو ٹھیس نہ لگ جائے"

دوشیزہ نے عظیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں ہلکا میٹھا طنز

تھا۔ "کیا سچ مچ ہندوستانی نوجوان عورت کے دل کو ٹھیس نہیں لگانا چاہتا کیا یہ آپ کہہ رہے ہیں"۔

عظیم نے جواب دیا "ہاں میں ہی کہہ رہا ہوں۔ ہر وہ نوجوان جو اپنے ایمان کی قدر و قیمت جانتا ہے کسی کے بھی دل کو دکھانے کے قبل کچھ سوچیگا"۔

دوشیزہ خاموش ہو گئی۔ ——— لیکن وہ زیادہ دیر تک چپ نہ رہ سکی۔ وہ بولی "آپ کچھ کہہ رہے تھے اور مگر کہہ کر چپ ہو گئے تھے"۔

عظیم نے کہا "ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ یہ حسین شکلیں بڑی حسین تھیں بڑی جاذب نظر تھیں مگر میں یہ کیسے بھول جاؤں کہ میں اس گھر میں پیدا ہوا تھا۔ جہاں آنکھ کھولتے ہی میں نے وہ ناچ دیکھا تھا۔ جو آج تک آپ اور آپ کے ہم وطن نہ دیکھ سکے۔ افلاس کا تلخ ننگا ناچ۔ ——— اکثر بھوک مجھے لوریاں دے دے کر سلا دیتی تھی ——— کتنی بار پیاس نے میرے گلے کی خشک رگوں کو کچلا ہے۔ کتنی بار تنگ دستی نے میرے دامن کو تار تار کیا ہے ——— اسی تلخ اور تاریک ماحول میں چودہ برس بیت گئے ——— بالآخر تقدیر کی دیوی کو رحم آیا۔ وہ مسکرائی اور مجھے کانپور میں کمپنی کے ایک انگریز عہدے دار کے یہاں خانساماں کی نوکری مل گئی۔ اسی وسیلے سے کچھ انگریزی اور فرانسیسی زبانیں سیکھیں تعلیم حاصل کرنے کی لگن لگ چکی تھی۔ میں نے نوکری چھوڑ دی۔ ——— کانپور کے انگریزی سرکاری اسکول میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے بعد میں وہیں ماسٹر ہو گیا"۔

دوشیزہ عظیم کی داستانِ حیات سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ بولی "نہیں عظیم

زندگی کی کیسی وحشتناک تلخیوں سے دوچار ہونا پڑا!"

عظیم نے گویا دوشیزہ کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ اپنے خیالات کی رو میں بہا چلا جارہا تھا۔ ٹیمس کی لہروں کی طرح ——— اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں ایک دن برہما ورت گیا ——— میرے آقا شری منت نانا صاحب کی مردم شناس نگاہوں نے مجھ کمترین کی قدر کی"

دوشیزہ بول اٹھی۔ "وہ کتنے اچھے ہیں"

عظیم نے بیچ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ہاں وہ بہت اچھے ہیں۔ ان سے اچھا انسان شاید ہی اس وقت دنیا میں کوئی اور ہو۔ مگر جانتی ہو اتنے اچھے انسان کے ساتھ تمہارے ہم وطنوں نے کیا سلوک کیا ہے"

دوشیزہ نے پوچھا "کیا؟"

عظیم نے جواب دیا۔ "میرے آقا کے پتا باجی راؤ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس شرط پر اپنا تخت و تاج دیا تھا کہ کمپنی اس کے معاوضے میں ان کو اور ان کے جانشینوں کو ہمیشہ آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ دے گی۔ باجی راؤ نے نانا صاحب کو اپنا متبنیٰ بنایا ——— کمپنی نے، نہیں ان کا حق دینے سے انکار کر دیا"

دوشیزہ نے پوچھا۔ "تو اب کیا ہو گا۔"

عظیم نے قدرے ترشی سے کہا "ہو گا کیا؟ ——— ہندوستانیوں کی رگوں کا لہو پانی تو نہیں ہو گیا ہے۔ ان کی تلواروں کو زنگ تو نہیں لگ گیا ہے۔ ان کے ذرہ بکتر آج بھی دشمنوں کی تیغوں کی دھاروں کو پرکھنے کے لئے بے چین ہیں۔"

دوشیزہ نے پوچھا "شولا پور، جھانسی، کانپور، اور دہلی کو شاید ایک جگہ پر اکٹھا

کر دینے کی کوشش کرنا ضروری ہو جائے گی۔"

عظیم نے دوشیزہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔" تم خطرے کی حد تک سمجھدار ہو۔"

دوشیزہ نے کہا۔" نانا صاحب کی کوشش تو یہی ہوگی کہ زیادہ سے زیادہ سامانِ جنگ حاصل کیا جائے۔"

عظیم نے جواب دیا۔" اگر یہ محض تمہاری ذہانت ہے تو قابلِ داد ہے۔"

دوشیزہ نے عظیم کی بات گویا سُنی ہی نہیں۔ وہ بولی۔" بریلی کی انگریزی فوجوں سے تو شاید آسانی سے توپیں لی جا سکتی ہیں۔"

عظیم نے اپنے کمربند کے ایک یاقوت کو انگلیوں سے گھماتے ہوئے کہا۔" اس حد تک ذہین نہ بنو کہ مجھے تم پر شک ہونے لگے۔"

دوشیزہ نے دو قدم آگے بڑھتے ہوئے کہا۔" خیر چھوڑو ان باتوں کو ——
ہاں تو تم غالباً مصر اور ترکستان ہوتے ہوئے ہندوستان واپس جاؤ گے؟"

عظیم کا ہاتھ فوراً اس کے تلوار کے دستہ پر پہنچ گیا۔ وہ کڑکا۔" تم یقیناً جاسوس ہو۔"

ایک عظیم اور مہیب قہقہے نے فضا میں ہیجان برپا کر دیا۔ دوشیزہ اور عظیم نے پلٹ کر دیکھا۔ رات کی تاریکی میں اس بوڑھے چہرہ کی بڑی بڑی گول آنکھیں انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ ہندوستانی زبان میں کہہ رہا تھا۔" عظیم تمہارا اندازہ قدرے درست ہے مینیلا سچ مچ جاسوس ہے۔"

عظیم نے مینیلا کی طرف دیکھا۔ اس کو کچھ حیرت ضرور ہوئی۔ جب اس نے دیکھا

کہ مینیلا کے لبوں پر تبسم رقص کر رہا ہے۔ بوڑھا پھر گرجا "مگر عظیم مینیلا ہماری جاسوس ہے ـــــ انگریزوں کی نہیں"۔

عظیم نے بوڑھے کو پہچانتے ہوئے کہا "کون باپو رانگاراؤ جی ـــــ مگر باپو جی یہ کیسے ہو سکتا ہے"؟

رانگاراؤ نے پھر قہقہہ لگایا۔ وہ بولا "کیوں نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں جب جھنرپتی اور نانا صاحب جیسے فرشتوں کے ساتھ بے ایمانی کی جا سکتی ہے۔ تو یہ کون سی بڑی بات ہے۔ مینیلا انگریز نہیں ہندو ہے۔ اس کا باپ ہندو تھا۔ اس کی ماں فرانسیسی تھی"۔

عظیم نے کچھ چڑ کر کہا "مگر میرے ساتھ یہ کیا تماشا کیا ہے"۔

رانگو جی نے کہا "سیاست کا تقاضا ہے کہ ہر ساتھی کی آزمائش کی جائے"۔

عظیم خاموش رہا۔

رانگو جی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا "ہم انگلینڈ میں ہیں ـــــ دشمن کے گھر میں۔ میں بھی یہاں تمہاری طرح جھنرپتی کے لئے انصاف کی تلاش میں آیا مگر مجھے ملا ایمان کا پتھر۔ انصاف کی لاش۔ اب ہمیں دشمن کے گڑھ میں بیٹھ کر ہندوستان کی نجات کا راستہ ڈھونڈنا ہے ـــــ انگریزوں نے ابھی براہمن کے غصہ کی آگ کو نہیں پہچانا ہے۔ وہ چال چلیں گے کہ کبھی بھولیں گے نہیں"۔

عظیم نے محض اتنا جواب دیا "میری تلوار اور میرا دماغ آپ کے حوالے ہے باپو جی"۔

۱۸۵۷ء

ہندوستان

مارچ کی ایک خلش پرور دوپہر

جھانسی کا آہنی قلعہ

راج دربار آراستہ تھا۔ مہارانی لکشمی بائی شجاعت و دلیری کی مورتی بنی راج سنگھاسن پر جلوہ گر تھیں۔ سپہ سالار۔ وزیر اعظم اور دیگر مصاحب دست بستہ خاموش کھڑے تھے۔ عظیم نے اپنے کلام کا سلسلہ ختم کرتے ہوئے کہا "یہ ہے وہ پیغام مہارانی صاحبہ ——— جو میرے آقا شریمنت پیشوا نانا صاحب دائیہ بہادر نے مجھے دے کر آپ کے حضور میں بھیجا ہے۔"

نوجوان مہارانی کے پاکیزہ لہجہ میں متانت تھی۔ سنجیدگی تھی اور وقار تھا۔ جب انہوں نے اپنی کٹار کو انگلیوں میں نچاتے ہوئے جواب دیا۔

"عظیم اللہ ہم تمہاری وفاداری سے بہت خوش ہیں ——— نانا بھیا کو ہمارا پیغام دینا کہ ہم اُن کے ساتھ میدانِ جنگ میں شریک ہونگے۔ بھیا نے بھارت ماتا کو سوتنتر کرنے کے لئے کھڑک اٹھائی ہے۔ ہم دور بیٹھے تماشا نہیں دیکھیں گے ہم تو پہلے ہی پرتگیا کر چکے ہیں کہ جھانسی ہماری ہے اور ہماری ہی رہے گی۔ اس قلعہ کی اینٹ سے اینٹ کیوں نہ بج جائے شترو کا جھنڈا اس کی ڈیوڑھی پر نہیں لہرائے گا۔"

سپہ سالار کا ہاتھ اس کی تلوار کے دستے پر پہنچ گیا۔ بہادروں کے چوڑے سینے

جوش و جذبات کے زیر و بم سے بلند ہو رہے تھے۔ درباریوں کے چہرے شجاعت اور مردانگی سے تمتما رہے تھے۔

عظیم نے کہا "قابلِ تحسین ہے وہ سرزمین جس نے آپ جیسی شیرنیوں کو پیدا کیا۔ قابل رشک ہے میرے آقا کی روشن تقدیر جن کو آپ جیسی بہن ملی۔ آپ کے ہوتے ہوئے کس میں جرأت ہے کہ مادرِ ہند کو طوقِ غلامی پہنا سکے"۔

مہارانی نے ماضی کے اوراق کو پلٹتے ہوئے کہا "ہمیں وہ دن یاد ہیں —— اچھی طرح یاد ہیں جب نانا بھیا ہمیں للکار کر کہا کرتے تھے" "آؤ چھبیلی تلوار چلائیں"۔ اور ہم بھیا کے ساتھ تین تین گھنٹے تلوار چلایا کرتے تھے عظیم ہم نے بھیا دوج کے دن نانا صاحب کے تلک لگایا ہے۔ ——— ان کی آرتی اتاری ہے۔ وہ پیغام نہ بھی بھیجتے ہم پھر بھی ان کے ہمراہ اس دھرم یدھ میں شریک ہوتے"۔

۱۸۵۷ء

ہندوستان

دلی کا لال قلعہ

اپریل کا گرم مہینہ

قلعہ کے پائیں باغ میں ایک مرمریں چبوترے پر مغلیہ تاجدار شاہ بہادر شاہ اپنی اطلسی مسند پر جلوہ افروز تھے۔ خصوصی مصاحبوں کے علاوہ اور کسی بھی شخص کو شرف باریابی عطا نہیں فرمایا گیا تھا۔

عظیم اللہ کہہ رہا تھا —— "ظلِ سبحانی کو فخر ہے کہ وہ شر مینت پیشوا

نانا صاحب والئے برہماورت کا پیام ہے کہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوا ہے۔"

سوال ہوا۔ "کیا پیغام ہے"؟

عظیم نے سنجیدگی سے کہا۔ "پیغام بغاوت ہے جہاں پناہ!"

سوال ہوا۔ "ہم وضاحت چاہتے ہیں"۔

عظیم نے عرض کی۔ "ظل سبحانی اس امر حقیقی سے خوب واقف ہیں۔ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مظالم نے ہندوستان کی روح کو کچل ڈالا ہے معصوموں کا قتل۔ بے گناہوں کا خون۔ عصمت مآب خواتین کی عصمت دری۔ مذہب کی توہین۔ ہمارے وطن کی مقدس سرزمین پر روز کے واقعات بن کر رہ گئے ہیں۔"

بہادر شاہ کا داہنا ہاتھ ان کے ہونٹوں پر چلا گیا۔ وہ اسی انداز سے کسی گہری بات کو سوچا کرتے تھے۔

عظیم اللہ کے جذبات نے اُسے چند لمحات کے لئے شاہی آداب سے بھی بے خبر کر دیا۔ اس کا داہنا پاؤں جوش میں آگے بڑھ گیا۔ داہنے ہاتھ کی انگلی سے پورب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عظیم نے کہا۔ "دولت مآب ہندوستان کے پورب میں زخمی بنگال جس غاصب کے خلاف انصاف کی دوہائی دے رہا ہے۔ دکن میں حیدر علی نے جس جابر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ ٹیپو سلطان نے جس قہار کے سامنے سر خم کرنے سے انکار کیا۔ اودھ کی بیگمات جس کے جور و استبداد کی اب تک نوحہ خواں ہیں۔ بنارس کی مقدس سرزمین جس کے ستم کی داستان دل شگاف پیرائے میں دہرا رہی ہے ——— اس کا مقابلہ کرنے کے لئے مادر ہند

کا طوق غلامی ہمیشہ ہمیشہ کو کاٹ دینے کے لئے۔ میرے آقا نے شمشیر بے نیام کر لی ہے۔ مادرِ وطن کے سپوت صدائے انقلاب کو لبیک کہہ کر سر دں پر کفن باندھ کر گھروں سے نکل پڑے ہیں، ——— ہندوستان بھر کی نگاہیں اس وقت حضور کی مدد کی منتظر ہیں"۔

بہادر شاہ نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ حاضر مصاحبوں پر ڈالی اور بولے "ہم ناناصاحب کی جرأت و مردانگی کی داد دیتے ہیں ——— مگر عظیم وہ ہم سے کس چیز کے خواہاں ہیں"۔

عظیم نے فوراً جواب دیا "ظلِ سبحانی اپنی ذاتی غرض کے لئے میرے آقا آپ سے کسی بھی چیز کے خواہاں نہیں ہیں وہ تیغِ تیموری سے وطن کی عزت و حرمت کے لئے آپکی رفاقت کی توقع رکھتے ہیں دولت مآب!"

بہادر شاہ نے پوچھا "تو تم تیغِ تیموری کو سمجھتے ہو"

عظیم نے جواب دیا "ہم اسی حوصلہ پر تو ظلِ سبحانی میں بغاوت کا پیغام لایا ہوں اہلِ نظر جانتے ہیں کہ جب کبھی وطن کی عزت کا سوال اٹھا تیغِ تیموری بنیام کے سکون سے منہ پھیر کے میدان جنگ کے شعلوں سے ہم آغوش ہوتی رہی ہے"۔

بہادر شاہ نے مسند سے اٹھتے ہوئے کہا "اپنے آقا کو پیغام دو کہ ہم ان کے دوست ہیں اور ان کے ساتھ دشمن ہند سے وقتِ مقررہ پر لوہا لینے میں اُن سے پیچھے نہیں رہیں گے"

عظیم اللہ نے نعرہ لگایا "ظلِ سبحانی زندہ باد ——— ہندوستان زندہ باد"!

مصاحبوں نے آمین کہا۔

۱۸۵۷ء

ہندوستان

برہماورت

اپریل کا آخر

عظیم اور تانتیا ٹوپی کلیان پور سڑک پر ٹہل رہے تھے۔ تانتیا نے کہا "عظیم بھیا! قلم اٹھانے والے ہاتھ تلوار بھی اٹھا سکتے ہیں۔ تم دیکھتے رہو ــــــــ دشمن اچانک ہر جگہ بغاوت دیکھ کر مارے ڈر کے ہندوستان چھوڑ دینے پر مجبور ہو جائے گا۔"

عظیم نے کہا۔ "ہاں نانا صاحب بھی کل یہی کہہ رہے تھے۔"

تانتیا نے پوچھا۔ "اور کیا کہا تھا انہوں نے۔"

عظیم بولا۔ "وہ کہہ رہے تھے کہ مجھے عظیم کے دماغ اور تانتیا کی تلوار پر اتنا ہی بھروسہ ہے جتنا اپنے آپ پر۔"

تانتیا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ بولا۔ "تو شریمنت کا بھروسہ کبھی نہ ٹوٹے گا عظیم!"

عظیم نے کہا۔ "کوشش تو یہی ہے۔"

۱۸۵۷ء

ہندوستان

برہماورت

یکم مئی

ناناصاحب گنگا کی لہروں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ شاید ان کی روانی میں اپنے دل کی اُلجھنوں کا حل ڈھونڈ رہے تھے۔ انہوں نے یک لخت پلٹ کر کہا "عظیم وہ کون بہادر تھا جو انگریزوں کی ایک ہندوستانی فوج سے دوسری ہندوستانی فوج میں بغاوت کا پیغام لے کر جا رہا ہے"!

عظیم اللہ نے جیب سے ایک روٹی نکال کر نانا صاحب کے حضور میں پیش کر دی۔

نانا صاحب نے قدرے حیران ہو کر پوچھا "یہ کیا"!

عظیم نے روٹی چاک کی۔ بغاوت کا پیغام ایک خط کی شکل میں روٹی کے اندر رکھا تھا۔

نانا صاحب نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "ہم تمہارے دماغ کی داد دیتے ہیں عظیم"!

عظیم اللہ سجدہ شکرانہ بجا لایا۔۔

۱۸۵۷ء

ہندوستان - ۶ مئی

نقارہ پر چوٹ پڑ گئی ــــــــ جنگِ آزادی شروع ہو گئی۔

بہادروں کے خنجر خون کے دریا میں غوطے مارنے لگے۔ رائفلوں کی نالیاں گولیاں اگلنے لگیں۔ توپوں کے بھیانک قہقہوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ بارک پور کی چنگاری میرٹھ میں شعلہ بن کر بھڑک اٹھی منگل پانڈے کے خون سے سینکڑوں شہید پیدا ہو گئے۔ جھانسی کا قلعہ ہر ہر مہادیو کے نعروں سے گونجنے لگا۔ کانپور کی دھرتی سرخ ہو گئی۔ لہو کی لہریں دریا بن کر سمندر بن گئیں۔ عظیم کے خواب کی تعبیر حقیقت کا جامہ پہن رہی تھی۔

قسمت کی دیوی روٹھی۔ پانسہ الٹا پڑا۔ تدبیر نے تقدیر کے حضور میں سر خم کر دیا۔ نانا صاحب لکشمی بائی۔ بہادر شاہ کی فوجوں کو شکست کی تاریکی نے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ـــــــ عظیم ـــــــ ہندوستان کا پہلا راج دوت ـــــــ عظیم اللہ خاں ـــــــ سینکڑوں حورانِ فرنگ کے دلوں کا بے نیاز تاجدار عظیم۔ ـــــــ کسی ہندوستانی محبوبہ کی یاد اپنے دل کی گہرائیوں میں۔ لئے وقت کی ظلمات میں نہ جانے کہاں چلا گیا ـــــــ تاریخ خاموش ہے۔

انگریزی فوجوں نے برہماورت کو لوٹنا شروع کیا۔ جنرل ہیولاک کے احکام تھے کہ عظیم کے گھر کے کونے کونے کی تلاشی لی جائے۔ وہ اس شخص کے دماغ کا جائزہ لینا چاہتا تھا جس نے انگلستان میں بیٹھ کر ہندوستان کی نجات کا راستہ سوچا۔ جنگ آزادی کا مسودہ دشمن کے گھر میں بیٹھ کر تیار کیا۔ سنگین بردار گوروں نے گھر کا چپہ چپہ ڈھونڈ مارا۔ لیکن کچھ بھی نہ ملا ـــــــ اچانک ہیولاک کے ہاتھ سیاہ آبنوس کی ایک صندوقچی لگی۔ انگریز حاکم کی نگاہوں میں امید روشنی بنکر ناچ اٹھی ـــــــ فوراً قفل توڑا گیا ـــــــ صندوقچی میں ان انگریز دوشیزاؤں کے محبت نامے تھے جو انہوں نے اپنے "ڈارلنگ عظیم" کو لکھے تھے ـــــــ

"پچھتاوا"

ہزاروں تفکرات سے دبا ہوا نرمل اپنے پلنگ پر لیٹا سوچ رہا تھا کہ انجنا نے اسے اتنی کڑوی بات کہہ کیسے دی۔ کیا واقعی اس نے وہ سنہرے دن بھلا دئیے جب ذرا سا تخلیہ پاتے ہی وہ کس ناز سے خود کو اس کی آغوش میں گرا دیا کرتی تھی۔ جب پہروں وہ اپنی بالکونی پر محض اس بات کے انتظار میں کہ کب وہ کالج سے لوٹتے وقت اس کے مکان کے سامنے سے گزرتا ہے بت بنی کھڑی رہتی تھی۔ اس کے ساتھ شادی کرنے کے لئے وہ خود اس سے کم بے چین نہیں تھی اور پھر شادی کے بعد وہ رنگین راتیں جب ریڈیو کی دھنیں خاموشی کا لبادہ اوڑھ کر ریڈیو گرام کے ننھے ننھے آبنوسی ایوانوں میں سو جاتیں۔ اور پرتھوی راج۔ سہگل۔ جگدیش سیٹھی۔ ترلوک کپور کلارک گیبل۔ نورما شیرر۔ پال منی سب کی اداکاری پر تنقید و تبصرے بغیر کسی فیصلہ پر پہنچتے ہوئے دم توڑ دیتے۔ تو دونوں کی نگاہیں چند لمحات کے لئے نیلے بلب پر ہم آغوش ہو جاتیں۔ اور پھر دونوں جذبات کے پروں کا سہارا لے کر محبت اور قربت کے ان مدہوش کن فلک بوس جزیروں میں پرواز کرنے لگتے۔ جہاں ہزاروں خاموشیوں

کی آغوش میں مرادوں کے آنسو موتی بن کر ڈھلتے رہتے ہیں۔ نزل ہر روز پیدا ہونے والے تلخ واقعات سے آنکھیں ملاتے ہوئے بھی گھبرا رہا تھا۔ اس کا شعور ماضی کی ان حسین راتوں کو ایک نقش باطل سمجھتا ہوا ٹھرا رہا تھا۔ جب انجنا کی کائنات اس کی محبت میں غرق ہو جانے کے بعد اپنے نکھار پر جھوم جھوم اٹھتی تھی۔ وہ کیف پرور راتیں جن میں بارہا انہوں نے چاند کو ناچتے دیکھا تھا اور پہروں تک حسین ستاروں کے نازک پیروں کی چھاگلوں کے سرمدی چھناکے سنے تھے۔ وہ نشہ بیز راتیں جب فضاؤں میں تیرتے ہوئے سرور انجنا کے ابریشمی رخساروں کو اور بھی سرخ کر دیتے تھے۔ اس کے یاقوتی لبوں کو اور بھی دمکا دیتے تھے اور اس کی غزالی آنکھوں میں دنیا بھر کی سرمستیوں کو ہلکے ہلکے لطیف گلابی ڈوروں میں منجمد کر دیتے تھے۔

اور انجنا اپنے پلنگ پر بیٹھی سوچ رہی تھی۔ کتنا منحوس دن تھا وہ جب میں نے نزل کے عشق ——— خدا جانے وہ عشق بھی تھا یا محض ہوس تھی ——— ہاں تو اس کے عشق سے متاثر ہو کر اس پر رحم کھا لیا تھا۔ چغدوں جیسی شکل۔ بچوں کے تو بھورے بال اچھے بھی لگتے ہیں مرد ہو تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ سوکھی مکی کے ٹھونٹھ پر مرجھائی بالیاں لٹک رہی ہیں۔ ابھی پڑھتے ہی تھے انجنیر صاحب کہ عورت کے بارے میں ضرورت سے زیادہ سمجھنے لگے تھے۔ کیا ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرا کرتے تھے مجھے دیکھ کر جیسے منہ میں دو چھٹانک نشتیل چینی بھر لی ہو۔ سوکھا سوکھا سا جسم اور اس پر چھوٹے تنگ مہروں کی پتلون۔ بالکل سارنگی کے خول جیسی پیچش کے مریض تھے۔ سوکھتے چلے جا رہے تھے۔ میں غریب سمجھی میرے پریم میں پتلے ہو رہے ہیں۔ نہ اچھی اچھی باتیں کرنی آتی ہیں۔ نہ رنگوں کی پہچان ہے نہ عطروں کو

سمجھ سکتے ہیں اور تو اور کپڑوں کے نام تک تو آتے نہیں۔ انجینئر صاحب بنے ہیں
بھاڑ کے۔ گرمیوں کے دنوں میں پلش کا تھان اٹھا لائے۔ سردیوں میں جارجٹ
تو کہیں گئی نہیں۔ میں نے اصرار کیا تو چلو انگریزی ناچ سیکھنے پر تیار ہوئے۔ رچرڈ
کا پیٹ نوٹوں سے بھر دیا۔ سیٹی بجانی تو آ گئی۔ قدم ملانے نہ آئے۔ چھوڑ چھاڑ
کر بیٹھ رہے بولے یہ کبڈی میرے بس کی نہیں ہے۔ جان بچی اور لاکھوں پائے۔
خیر سے بدھو گھر کو آئے۔ چلو چھٹی ہوئی۔ ہائے ری عقل انجینئر ہیں آپ۔ انجینئر۔
اس دن ہیلن کے شوہر پرو بیپ سے بازی لگا بیٹھے آپ کہ رولز رائس موٹر کا
نام ہے ہوائی جہاز کا نہیں۔ وہ لاکھ کہتا رہا۔ انجینئر صاحب! رولز رائس نہ موٹر
کا نام ہے اور نہ ہوائی جہاز کا۔ یہ ایک کمپنی کا نام ہے جو اس نام کی پہلے موٹریں
بناتی تھی۔ اب ہوائی جہاز کے انجن بنا رہی ہے۔ مگر تو یہ اپنی قابلیت کا گھمنڈ
تھا۔ پچاس روپے ہارنے تھے ہار گئے۔ بیڑا غرق ہو جیوتشی جی کا۔ آپ کو
Lucky Stone بھی بتایا تو مونگا ڈھائی من کا ڈھول انگلی پر باندھے
گھوم رہے ہیں۔ نگ نے کرشمہ دکھایا۔ سالانہ ترقی بھی رک گئی۔ آپ کی منطق
سنیئے فرما رہے ہیں۔ اگر نہ پہنتا تو شاید نوکری جاتی رہتی۔ آپ جیوتشی جی کو پیغمبر
ہی سمجھ بیٹھے۔ پتھر پڑیں اس عقل پہ۔ اتنا بھی نہیں سمجھے کہ منہ کا ذائقہ بدلنے کے
لیے آج تک انسان نے تین چیزیں دریافت کی ہیں۔ پان چیونگ گم اور جیوتش۔
ہوا کبھی دل بہلا لیا۔ زیادہ پان کھانے سے ہوتا کیا ہے۔ دانت دیکھئے تو معلوم ہوتا
ہے گوبر کھا کر تشریف لا رہے ہیں۔ منصوری پیسہ کھینچ کر ماریئے دانتوں پر یوں
چپاں ہو جائیگا کہ چھڑائے نہ بنے اور زیادہ چیونگ گم چبائیے۔ دیکھے ہیں

اجڈ ناسمیوں کے دانت جیسے چیڑھ کے پڑنے تختے سے وارنش اکھڑ رہی ہو۔
انسان کیا اچھا خاصہ جانور بن جاتا ہے۔ کہ جگالی کرنے سے ہی فرصت نہیں۔
اور زیادہ جیوتشیوں کے چکر میں پڑیئے تو سن لیجئے۔ کہ چھینک آئے تو مین کیا کہتی
ہے۔ میکھ کیا بکتی ہے۔ بائیں آنکھ پھڑکے تو بیڑا غرق۔ داہنی پھڑکے تو بھر گئے
کوٹھے سونے کی مہروں سے۔ جی آنکھ نہ ہوئی بیزرو بنک کا Debit
Credit کا کھاتہ ہو گیا۔ اور سنئیے اس دن صبح صبح آپ جیوتشی جی سے کہہ
رہے تھے ”رات مہاراج خواب میں غلاظت ہی غلاظت دیکھی ہے“۔
جیوتشی کی جیوتش کسی مسخرے کی تخلیق معلوم ہوتی ہے۔ پرانی سی پوتھی میں
سے سنا دیا۔ مہاراج لکشمی ملے گی۔ توبہ اگر دولت یونہی ملنی ہے تو خواب پر
حقیقت کو کیوں نہ ترجیح دی جائے۔ نتیجہ یقیناً بہتر رہے گا۔ کیوں نہیں کلو
مہترانی سے صبح صبح دو بالٹیاں غلاظت کی اپنے اوپر ڈلوا لیتے۔ اندر باہر لکھشمی
سے بھر جائیں گے۔ اور مزاج ——— سوائے وحشی پن کے دوسرا کوئی کام
ہی نہیں۔ شادی ہوئی تھی۔ امنگیں بڑھی ہوئی تھیں۔ ہو گئی چار دن کی چہل پہل۔
مگر ان کو کون سمجھائے۔

اور نرمل نے پھر سوچا۔ ممکن ہے اتنی بڑی بات انجنا نے مذاق میں کہہ دی
ہو۔

اور انجنا سوچ رہی تھی۔ اس بار پوچھیں گے تو یہی جواب دونگی۔
اور نرمل نے پوچھ ہی لیا۔ ”انجنا! کیا سچ مچ تمہیں مجھ سے نفرت ہو گئی
ہے“۔

انجنا کا جواب تھا۔ "جی ہاں! سچ مچ۔"

نرمل کے لہجے میں بے بسی تھی۔ "تو یہ نفرت اب محبت میں تبدیل نہیں ہو سکتی ہے؟"

انجنا کے جواب میں اتنا ہی روکھا پن تھا۔ "بہت مشکل دکھائی پڑتا ہے۔"

نرمل نے اُسی بے بسی سے پوچھا۔ "کیوں"؟

انجنا نے کہا۔ "کیونکہ آپ سے آپ کی دُنیا سے اور آپ کی دُنیا کی ہر چیز سے میرا جی اکتا گیا ہے۔"

نرمل تلخ سا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ وہ بولا۔ "تمہارے مزاج میں بہت تبدیلی آ گئی ہے۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ جیوتش ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک۔ یہ سب تمہارے منگل کی خرابی ہے۔"

انجنا نے چڑ کر کہا۔ "تو جب تک میرا منگل خراب ہے مجھ سے دُور رہیئے۔"

نرمل نے انتہائی سادگی سے کہا۔ "جی نہیں۔ اس کا علاج یہ نہیں ہے۔ آپ بھی مونگا پہنیئے۔"

انجنا اور چڑ گئی۔ "بھاڑ میں گیا مونگا اب آپ سو جائیے۔"

نرمل خاموش ہو گیا۔ مگر اس کا دماغ نئی اُلجھنوں میں پھنستا چلا جا رہا تھا۔ اس نے اپنی مونگے والی نگ کی انگوٹھی داہنے ہاتھ میں سے نکال کر بائیں ہاتھ میں پہن لی۔ انجنا نے بھی دزدیدہ نگاہوں سے اس کی اس حرکت کو دیکھا۔ اُسے نرمل کی سادہ لوحی پر ایک لمحہ کے لئے کچھ ترس سا آیا۔ مگر یہ ترس بھی ایک

معمول کی چیز تھی۔ اس کا دماغ ایک بار پھر نفرت کے نئے زاویے تراشنے لگا۔

اور نرمل نے سوچتے سوچتے کہا۔ "مجھے ایک بہت اچھی ترکیب سوجھی ہے۔"

انجنا نے انتہائی روکھے پن سے کہا۔ "فرمایئے!"

نرمل کے لہجہ میں ایثار و خلوص کے ساتھ دل شکنی کی بھی کھنک تھی۔ جب اس نے کہا۔ تم پچھلے اتوار کو کہہ رہی تھیں نا کہ تمہارا جی اپنی بہن کے ہاں کھنڈوے جانے کو چاہتا ہے۔

انجنا نے پوچھا۔ "تو؟"

نرمل نے اسی لہجہ میں کہا۔ "تو میرا یقین ہے کہ اگر تجربے گرہوں کی دنیا میں انسان جگہ تبدیل کر دے تو اس کے لئے بہتر رہتا ہے۔"

انجنا نے محض "جی ہاں" کہا۔ اور اس کے جی ہاں کہنے میں فولاد کی سختی اور خدشات کے گہرے سائے گونج رہے تھے۔

نرمل بولا۔ "تو تم کھنڈوا گھوم آؤ۔"

اس بار انجنا بولی۔ "مگر کھنڈوا جا کر بھی مجھے آرام کہاں ملے گا۔ میرے وہاں پہنچتے ہی آپ کے خط آنے شروع ہو جائیں گے!"

نرمل نے پوچھا۔ "تو تم مجھ سے اس قدر بیزار ہو گئی ہو؟"

انجنا کے لہجے میں انتہائی تلخی تھی۔ وہ بولی۔ "بیزاری نا بیزاری کا تو مجھے علم نہیں۔ مگر اتنا ضرور جانتی ہوں۔ کہ میری ہڈیوں کو آپ کے ساتھ رہ کر کبھی چین نہیں مل سکتا ہے!"

نرمل نے فراخدلی سے کہا۔ "نہیں اس بار تم مہینہ دو مہینہ کے لئے گھوم آؤ۔"

انجنا کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اور اس کے شعور میں نفرت اور تغافل کی چنگاریاں بھڑکتی چلی جا رہی تھیں۔

ادھر نرمل کی آواز تک سے نرمل کی دلی کیفیت کا اندازہ ہو سکتا تھا وہ بولا۔ "انجنا تم بالکل جذباتی ہو۔ کسی کو اچھا سمجھنے لگتی ہو۔ تو دیوتا بنا ڈالتی ہو۔ اور نقص دیکھنے پر آتی ہو تو شیطان بنا ڈالتی ہو۔ تم ذرا خلوص کی نگاہوں سے دیکھو۔ میں اتنا برا نہیں ہوں جتنا تم مجھے سمجھنے لگی ہو۔"

انجنا کا پارہ پھر چڑھا۔ وہ بولی "خلوص برتتے برتتے تو یہ دن آ گیا ہے کہ اپنے آپ کو اس چہار دیواری کا قیدی بنا کر رکھ لیا ہے۔ میرا من اداس ہوا آپ سے تو کبھی کچھ نہیں کہا۔ اکیلے بیٹھ کر خود ہی آنسو بہا لیے۔ زندگی حرکت چاہتی ہے۔ تبدیلی مانگتی ہے۔ یہاں صبح اٹھو وہی کمرے۔ وہی ریڈیو۔ وہی کھانا۔ وہی کپڑے۔ وہی مشینیں۔ وہی ہنسنا وہی رونا۔ روز روز کا امرت بھی اجیرن ہو جاتا ہے۔ تم ہو تمہارا من دفتر کی فضاؤں میں بہل جاتا ہوگا۔ مجھے تو اس گھر سے کیا، اس شہر تک سے نفرت ہو گئی ہے۔"

نرمل نہ جانے کیا سوچ کر سوائے اس کے کچھ نہ بولا۔ "تو تم کھنڈالا چلی جاؤ۔ آجکل وہاں موسم بھی بہت اچھا ہوگا۔"

انجنا نے رہا سہا شک بھی مٹانا چاہا۔ وہ بولی "آپ سچ کہہ رہے ہیں؟"

نرمل کچھ جھینپ سا گیا وہ بولا "اب تم تو یقین ہی نہیں کر رہی ہو۔"

انجنا نے پوچھا۔ "تو میں کل چلی جاؤں"۔

نرمل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "اب کل تو دِشا شول ہے۔ پرسوں چلی جانا"۔

انجنا بولی۔ "اچھا پرسوں ہی سہی"۔

انجنا کا دماغ نفرت اور تغافل دونوں نقطوں کے درمیان چکر لگانے لگا۔ اور اسی ادھیڑ بن میں وہ نیند کی ہلکی ہلکی لہروں میں کھو گئی۔

دہلی کے اسٹیشن پر ایک اور خوبصورت سی عورت اُس کے ڈبے میں آ سوار ہوتی۔ اب اس ڈبہ میں محض دو سواریاں تھیں۔ ایک انجنا اور ایک وہ ادھیڑ سی عمر کی حسینہ۔ انجنا اس کے سامان کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ مگر کی کھال کے آدھا درجن مختلف سائزوں کے سُوٹ کیس Emerson کا پاکٹ ریڈیو۔ پاملٹ کا بڑا بیٹری اور بجلی سے چلنے والا R.C.A کا ریڈیو Sound Profector 16 M.M کتنے ہی Hold all۔ آدھا ڈبہ رنگ برنگے سامان سے بھرا ہوا تھا۔ انجنا سوچ رہی تھی۔ کیسی ریاست کی راجکماری ہوگی کتنی جاذب نظر صورت ہے۔ کیسا تیکھا ناک ہے۔ کتنی بڑی بڑی آنکھیں ہیں۔ بسکٹی رنگ کی ساڑھی کتنی پھبن دے رہی ہے۔ لاکھ کہا تھا انجنیر صاحب سے کہ ایک پلاسٹک کی ساڑھی مجھے بھی لا دیں۔ مگر تو یہی کہہ کر ٹالتے رہے۔ کہ پلاسٹک کی ساڑھی میں آگ لگ جانے کا خطرہ ہے۔ کوڑھ مغز کھوپڑی۔

یہ بھی نہیں جانتے کہ پلاسٹک اور سیلو لائیڈ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بنے پھرتے ہیں انجینئر۔ اپنے اپنے پچھلے جنموں کی کمائی ہے۔ اس رانی نے موتی دان کیے ہونگے۔ ہیروں میں کھیل رہی ہے۔ میں نے کوّے مارے ہونگے۔ انجینئر نصیب میں ملا۔

اسی اثنا میں اس کی ہم سفر نہانے کے لئے غسل خانہ کی طرف چلی گئی۔ غسل خانہ سے جس وقت وہ باہر نکلی۔ چہرہ پف پاؤڈر سے چمک رہا تھا۔ اور بال ایوننگ ان پیرس میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انجنا نے خود کو اس کے سامنے حقیر سا محسوس کیا۔ دونوں کافی دیر تک خاموش بیٹھی رہیں۔

بالآخر اس نے انجنا سے پوچھ ہی لیا۔ "آپ کہاں جا رہی ہیں"؟

انجنا نے دبی سی زبان سے کہا۔ "کھنڈوا۔ اور آپ"؟

وہ بولی "بمبئی۔ جب تو آپ کا کافی ساتھ رہے گا۔"

انجنا کی جھینپ قدرے کھل گئی۔ اُس نے پُوچھا۔ "آپ بمبئی ہی میں رہتی ہیں"؟

جواب ملا۔ "جی ہاں"۔

اب انجنا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا پُوچھے۔ اس کی ہم سفر نے اُس سے پُوچھا۔ "آپ کا کوئی رشتہ دار ہوگا کھنڈوا میں"؟

انجنا نے جواب دیا۔ "جی ہاں وہاں میری بہن ہے"۔

انجنا نے بھی پُوچھا۔ "آپ کے پتی کیا کرتے ہیں"؟

اور انجنا یہ سُن کر حیران رہ گئی۔ "تعجب ہے آپ نے مجھے پہچانا نہیں میرے فوٹو تو قریب قریب روز ہی اخبار میں نکلتے رہتے ہیں۔ میرا نام پاروہ ہے"۔

انجنا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ پارو کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ پارو ہندوستان کی مشہور رقاصہ آج اس کے ساتھ ریل کا سفر کر رہی تھی۔ ہاں یہ تو بالکل پارو ہی ہے۔ آنکھیں بھویں تبسّم۔ سب کچھ اخباروں میں چھپنے والی تصویروں سے ہی تو ملتا ہے۔ انجنا اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھنے لگی۔ اس کی آواز تھرا رہی تھی۔ جب اُس نے کہا۔ "مجھے کبھی خواب میں بھی خیال نہ تھا کہ میں آپ کے ساتھ اس طرح ریل میں سفر کرونگی۔"

پارو محض مسکرا دی۔

انجنا نے کہا۔ "آپ کا تو باہر کے ملکوں میں بھی بہت نام ہے"۔

پارو کی مسکراہٹ میں ملاحت بھی تھی اور تکبّر بھی۔ انجنا کا جی چاہتا تھا کہ اب وہ اس سے باتیں ہی کرتی چلی جائے۔ وہ بولی "ہندوستان میں رقص کے ماہر محض تین ہی تو ایسے آرٹسٹ ہیں۔ جنہوں نے بھارتی فن کو غیر ملکوں سے متعارف کیا ہے۔ آپ۔ جے شنکر اور کرشن گوپال"

پارو نے Vanity case میں سے آئینہ نکال کر ہونٹوں پہ لپ سٹک کا ایک نیا لیپ دیتے ہوئے کہا۔ "کرشن گوپال نے تو قدیم اور جدید دونوں فنوں کو گڈمڈ کر کے رکھ دیا ہے۔ اور رہے جے شنکر۔ وہ یو پی کے ناچ سیکھا مدراس میں۔ اور مدراسی رنگ نے ان کے شعور کو اتنا متاثر کر کے رکھ دیا ہے کہ آسام کا منی پوری ناچ بھی مدراسی سانچے ہی میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

انجنا نے کہا۔ "مگر آپ تو ہر چیز کو اُس کے اصلی روپ ہی میں پیش

کرتی ہیں"

پارو کے ہونٹوں پر تکبر بھر مسکراہٹ بن کر ناچ اٹھا۔ وہ بولی "جی مگر یہ چیز حاصل کرنے کے لئے مجھے جتنی محنت کرنی پڑی ہے میں ہی جانتی ہوں"۔

انجنا نے پوچھا۔ "شوتانڈو کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے"؟

پارو بول اٹھی "بہ آپ کو رقص سے کافی دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو شوتانڈو ہی ایک ایسا ناچ ہے۔ جو نو رسوں کا مجموعہ ہے۔ اور جس کی ہر مدرا اپنی جگہ مکمل ہے۔ اور اس لحاظ سے اسے رقصِ مکمل کہا جاتا ہے۔"

انجنا پارو کی قسمت پر رشک کر رہی تھی۔ اس کے دماغ میں ایک خواہش خراش پیدا کرنے لگی۔ "کاش وہ بھی رقاصہ ہوتی۔ اس کے چرچے اخباروں میں ہوتے۔ وہ بھی اپنے آپ کو آرٹسٹ کہہ سکتی۔ انجینئر تو ایک ایسا جوا بن کر گلے سے الجھا ہے کہ دم ہی نہیں لینے دیتا۔"

اس نے دبی زبان سے پوچھا "ایک عام عورت کتنے دنوں میں ناچ سیکھ سکتی ہے"؟

پارو بولی "اپنی اپنی سمجھ ہے۔ مگر آپ کے جسم کی بناوٹ اور چہرے کے نقوش ظاہر کرتے ہیں کہ آپ دنوں ہی میں ناچ سیکھ سکتی ہیں"۔

انجنا کے دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ "کیا واقعی وہ بہت جلد ناچ سیکھ سکتی ہے"؟

پارو نے پوچھا۔ "آپ کے کتنے بچے ہیں"؟

انجنا نے کہا۔ "بچہ تو کوئی نہیں ہوا۔"

پارو بول اٹھی۔ "بہت خوب۔ یہ آپ کے حق میں بہت اچھی چیز ہے۔ ہاں آپ کے پتی کیا کرتے ہیں؟"

انجنا مریل سی آواز میں بولی۔ "انجینئر ہیں"۔

پارو کچھ سوچ میں پڑتے ہوئے بولی۔ "تو کیا وہ اجازت دے دینگے؟"

انجنا نے کہا۔ "وہ میری باتوں میں دخل نہیں دیتے۔"

پارو کچھ دیر خاموش رہی۔ اور پھر وہ کھڑکی کے باہر پیچھے رہ جاتے ہوئے درختوں کو دیکھتی ہوئی بولی۔ "اچھے مزاج کے آدمی معلوم ہوتے ہیں انجینئر صاحب!"

اور انجنا پھوٹ پڑی۔ "انجینئر صاحب ایک عجیب آدمی ہیں۔ انہیں اپنے جونئش ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ بالکل بوسیدہ خیالات کے آدمی ہیں۔"

پارو سوچتے ہوئے بولی۔ "آج کل ماں باپ آنکھیں بند کر کے لڑکی کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔"

انجنا نے کہا۔ "مگر یہ شادی تو میری پسند سے ہوئی تھی۔ اس وقت مجھے انجینئر صاحب میں کوئی عیب نہیں دکھائی دیتا تھا۔"

پارو سمجھ گئی۔ کہ انجنا ایک جذباتی لڑکی ہے۔ وہ بولی "ہماری ذرا ذرا سی غلطیاں بعض مرتبہ کتنی مضحکہ خیز حالتیں پیدا کر دیتی ہیں۔ وہ جوش اور امنگوں کا زمانہ ہوگا۔ آپ کے جذبات نے آپ کو ٹھنڈے

دل سے سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی ہوگی۔"

انجنا بول اٹھی "آپ نے بہت سچ سمجھا ہے۔"

پارو آگے بڑھی "آپ کے جسم کو دیکھ کر اگر یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ گھر گرہستی کے جھمیلوں نے آپ کی صحت پر بہت بُرا اثر کیا ہے۔ تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے میں اور اپنے جسم کی بناوٹ کو برقرار رکھنے میں بھی پُوری جد و جہد کی ہے۔"

انجنا نے جھینپتے ہوئے سر جھکا لیا۔

اور پھر پارو یک لخت بول اٹھی "میں ذرا آپ کو ناچ کے کپڑوں میں دیکھنا چاہتی ہوں۔" اور اتنا کہتے کہتے اس نے اپنا سوٹ کیس کھول کر ناچ کی پوشاک اور ننھا سا مکٹ انجنا کے سامنے رکھ دئیے۔ پارو کے پیہم اصرار نے انجنا کو یہ لباس بھی پہنا دیا۔ انجنا نے اپنی شکل آئینہ میں دیکھی تو اس کی نگاہیں اپنی خوبصورتی کے احساس سے چمک اٹھیں۔ رات ہو گئی تھی۔ ریل چلنے کی آواز میں انجنا کو رقص کے گھونگھروؤں کی صدا سنائی پڑ رہی تھی۔ تا تھئی۔ تا تھئی۔ تنت تنت تھئی۔ تا تھئی۔ تا تھئی۔ تنت تنت تھئی ———

وہ اپنی برتھ پر لیٹی سوچ رہی تھی۔ دو مہینہ بعد پھر وہی انجینئر صاحب وہی ان کے بین میکھ۔ وہی گھر کی چار دیواری اور وہی رات کو رونا دھونا کاش اس کے دل میں پارو جیسا حوصلہ ہوتا۔ اور کھنڈوا میں بھی کیا ہوگا۔ وہی کھوسٹ سی بہن اور اس کے آدھ درجن رنگ برنگے بچے۔ وہی دمہ کے مارے ہوئے جیجا جی۔ صبح صبح تپائی پر بیٹھے وہی پھٹے ہوئے دودھ جیسی

بلغم کے لچھے کے گچھے اُگل رہے ہیں ——— دو مہینے۔ کاش یہ دو مہینے
میں پارو کے ساتھ رہ سکوں۔ انجنیئر صاحب کو تو کوئی اعتراض ہوگا نہیں۔
اور یہ سوچتے سوچتے اس نے قریب ہی برتھ پر لیٹی ہوئی پارو سے پُوچھا۔
"اگر بمبئی آؤں تو آپ کو کہاں مل سکتی ہوں"؟

پارو نے کہا۔" اب آپ آنے والے کا سوال چھوڑیئے اور یہ فیصلہ کیجئے۔ کہ آپ میرے ساتھ ہی بمبئی چلیں گی۔ اور پھر وہاں سے چاہے آپ کھنڈوا چلے جائیے گا چاہے اپنے گھر۔"

انجنا کی بات میں قطعی بناوٹ تھی۔ اس نے اٹکتے اٹکتے کہا۔" انجنیئر صاحب کو لکھنا ہوگا اور آپ کو بھی تکلیف ہوگی۔"

پارو نے کہا"جی نہیں مجھے خوشی ہی نہیں بلکہ اس بات کا فخر ہوگا۔ کہ میں اُس لڑکی کو ناچ کی دُنیا میں لئے جا رہی ہوں جس کو بھگوان نے شاید اسی آرٹ کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور جو اپنی مجبوریوں کی وجہ سے زندگی کی عام لکیروں میں الجھی ہوئی ہے۔"

انجنا نے اٹکتے اٹکتے کہا۔" شکریہ!"

پارو ایک دم اٹھ بیٹھی اور بولی"۔ ابھی فیصلہ کیجیے کہ آپ میرے ساتھ بمبئی ضرور چلیں گی۔"

بمبئی میں بوڑھے پنڈت جی انجنا کو سکھا رہے تھے کہ شو تانڈو کے بول کا ٹھیکہ چار تال کا ہوتا ہے اور یہی شو جی کی بنائی ہوئی آدی تال ہے۔ دھا دھا۔

دن تا - کنت دھا گے - دن تا - تت کت - گدی - گن دھا ـــــــــ اس میں ایک پانچ - نو - گیارہ پر تالی ہوتی ہے اور انجنا یہ سب کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی - وہ بولی " مہاراج شو جی کو ناچنے کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی ؟"

پنڈت جی نے شو تانڈو کی تاریخ کو اپنی نگاہوں میں تولتے ہوئے کہا - " اور ستی کی لاش کو کندھے پر رکھ کر شو دنیا کے کونے کونے میں بھٹکنے لگے - ہمالیہ کے روتے ہوئے آبشاروں نے انہیں اور مغموم کر دیا - وادیوں میں چٹکی ہوئی کلیوں کے پھٹے ہوئے دامنوں کو دیکھ کر وہ اور تڑپ اٹھے - کالی گھٹاؤں کی پر ہول سسکیوں نے ان کا رہا سہا قرار بھی چھین لیا - نہ ختم ہونے والی فرقت کی گھڑیوں نے انہیں دیوانہ بنا دیا - ان کے صبر کے پاؤں ڈول گئے - ان کے قدموں کو حرکت ہوئی - شو تانڈو کی تخلیق ہو اٹھی - دنیا دہلنے لگی - چاروں طرف ہاہاکار مچ گئی "

اور انجنا نے سوچا - میں بھی اپنے ارمانوں کی لاش کندھوں پر رکھ کر گھر سے گھومنے نکلی تھی - میرے قدموں کو بھی حرکت ہوئی - اور میں بھی شو تانڈو ناچ ناچنے لگی - اور اس کے بعد - اس کی طبیعت مضمحل ہونے لگی - وہ بولی - " مہاراج اب کل سیکھونگی " - پنڈت جی چلے گئے -

اور اسی طرح ڈیڑھ مہینہ گزر گیا - اس دوران میں اس نے محسوس کیا کہ مشہور رقاص راجن اسے عجیب و غریب نگاہوں سے گھورتا رہتا ہے - اس دن پنڈت جی نے ان لوگوں کو کام رتی ناچ کے بول سکھائے تھے - وہ کہہ رہے

تھے"۔ شوجی نے کام دیو کو بھسم کر دیا۔ دنیا کانپ اٹھی۔ سنسار کی تخلیق بند ہو جائے گی۔ اس خیال سے دیوتا لرز اٹھے اور رتی کام دیو کی محبوبہ رتی کے جذبات کی دنیا تہ و بالا ہو گئی۔ وہ روئی۔ وہ چلائی۔ وہ گلاب کی پتی پہ شبنم کے قطرے کی طرح کانپتی ہوئی شو کے حضور میں دو زانو ہو گئی۔ وہ اپنے کام دیو کے جیون کی بھیک مانگ رہی تھی۔ اس کا دل اس کے آنسوؤں میں بہا چلا جا رہا تھا ———— وہ چلائی۔ مہاراج! جب دنیا میں محبوبوں کی ملاقات نہ ہو گی۔ برساتیں انگارے اگلنے لگیں گی۔ بسنت کا موسم سیاہی کا لبادہ اوڑھ لے گا۔ ساون کے بادل شعلے برسانے لگیں گے۔ کوئلیں کو کتی کو کتی مر جائیں گی۔ پپیہوں کے جگر پھٹ جائیں گے اور آپ کی پاروتی بھی تو خون کے آنسو روتی روتی آنکھوں کی جوت سے محروم ہو جائے گی۔ شو کو رحم آ گیا۔ انہوں نے کام دیو کو جیون دان دے دیا۔ آسمان میں نقارے بجنے لگے۔ فضا میں نفیریوں کی صدا گونج اٹھی۔ پریمیوں نے شنکھ پھونک دیئے"۔

پھر اس شام کو جوہو کے ریتیلے کنارے پر جب سمندر گہری گہری سانس لے رہا تھا۔ اور چاند کی کرنوں نے لہروں کے دھانی دوپٹوں پر مقیش ٹانک دی تھی اور ساحل پر بندھی ہوئی ننھی ننھی ڈونگیاں معصوم کلیجوں میں کانپنے والی آرزوؤں کی طرح ڈول رہی تھیں۔ راجن نے کہا تھا۔ "انجنا! پھر شوجی نے یہی سوچا کہ بسنت کا موسم سیاہی کا لبادہ اوڑھ لے گا۔ برساتیں چنگاریاں اگلنے لگیں گی"۔

اور انجنا سوچ رہی تھی۔ "کاش ایسی باتیں وہ انجینئر بھی کر سکتا"۔

راجن نے کہا۔ "تمہارے پاس تو عورت کا دل ہے۔ کیا تم نہیں سمجھ سکتیں کہ یہ آواز ایک ایسے ٹوٹے ہوئے دِل کی صدا ہے۔ جس کا علاج محض تمہارے پاس ہے۔"

اور انجنا نے سوچا۔ "انجنیئر کا دل ٹوٹا ہوا نہیں تھا۔ اور اسی لئے اس کے پاس ایسے حسین الفاظ نہیں تھے۔" راجن نے کہا۔ "دِل سے نکلی ہوئی عاجزی کی صداؤں کو اٹل تپسوی شِو نے بھی سُن لیا تھا۔ انہوں نے بھی کام دیو کو جیون دان دے کر رتی کی محبت کی لاج رکھ لی تھی۔ اس بار انجنا نے کہا۔ "مگر راجن یہ راستہ گناہ کی طرف جاتا ہے۔"

راجن نے فلمی انداز میں کہا۔ "کسی غمزدہ کے بلکتے ہوئے ارمانوں کو آرزوؤں کی بھیک دینا گناہ نہیں ہوتا۔"

انجنا بولی۔ "مجھے تعجب ہے۔ آرٹسٹ بھی نفس کے اس گھناؤنے پہلو کی طرف راغب ہوتے ہیں۔"

راجن فلسفیانہ انداز میں بولا۔ "جذبات کی شدت اور اس شدت میں جذبات کا نکھار ان چیزوں کی بہتات ہی سے تو ایک انسان آرٹسٹ بنتا ہے۔"

انجنا بنچ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "معاف کیجئے گا۔ آپ کو آرٹ اور آرٹسٹ کے بارے میں خاک بھی علم نہیں ہے اور اب مجھے یقین ہو گیا ہے۔ کہ آپ آرٹسٹ بھی نہیں ہیں۔" اور وہ جوہو سے چلی آئی۔

تین چار روز تک وہ بہت اداس رہی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ انجنیئر صاحب کے پاس واپس لوٹ جائے۔ یا انہیں خط لکھے کہ وہ بمبئی میں اپنی

سہیلی پارو کے پاس ہے اور جلد واپس آرہی ہے۔ مگر وہ نرمل کو کچھ بھی نہ لکھ سکی۔

اور پھر ایک دن گرین روم میں تخلیہ پاتے ہی راجن نے اس سے کہا تھا۔ "پارو کو تم آرٹسٹ سمجھتی ہو یا نہیں"۔ انجنا نے کہا تھا۔ "کیوں نہیں"۔ راجن نے کہا تھا۔ "تو آج میں تمہیں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ پارو کتنی بڑی آرٹسٹ ہے"۔

اور اس رات جوہو پر انجنا کو واقعی ایک ہوٹل کی کھجور کی چٹائیوں سے بنی ہوئی جھونپڑی میں راجن نے دکھایا کہ ایک کوتاہ گردن سیاہ فام سیٹھ بری طرح پارو کو جھنجھوڑ رہا تھا۔ انجنا کو احساس ہو رہا تھا۔ کہ اب اس کی قوتِ ارادی اتنی لاغر ہو چکی ہے کہ اسے پارو سے نفرت ہو جانے کے باوجود جب اس کے قدم گھر کی طرف بڑھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو کوئی چیز انہیں جکڑ کر رکھ دیتی ہے۔

دوسرے ہی روز اس نے بوڑھے پنڈت جی سے پوچھا۔ "پنڈت جی شریف گھروں کی لڑکیوں کو اس طرح ناچ سیکھنا چاہیئے"؟

پنڈت جی نے یک دم اپنا سوال پوچھ لیا "یہ سوال اچانک کیسے تمہارے ذہن میں آگیا"۔

انجنا نے سفید جھوٹ بولا۔ "میرے اس سوال پوچھنے کی کوئی خاص وجہ نہیں۔ مجھے یہاں کے ماحول میں کچھ گھٹن گھٹن سی محسوس ہوتی ہے"۔

پنڈت جی نے اٹک اٹک کر کہا۔ اُن کی آواز بہت آہستہ تھی "یہ فن

ہے۔ بھارتی فن یہ بہت پوتر اور بڑی چیز ہے۔ اس کو کلا کے پجاریوں نے اپنے خون سے سینچا ہے۔ للچاتی ہوئی نگاہوں سے بچانے کے لیے اسے کبھی مندروں کی چہار دیواریوں میں بند کر کے دیوتاؤں کے ارپن کر دیا گیا تھا۔ تاکہ فن کے پجاری۔ فن کی پوترتا کو واسنا کے نشے میں تبدیل نہ کر سکیں۔ فن کاروں کی اس دنیا میں آنے سے پہلے مرد اور عورت کو یہ بھول جانا پڑتا تھا کہ ان کے اندر کوئی چیز جنس بھی ہے۔ کردار کی گراوٹ فن کار کی موت ہوتی ہے"۔

انجنا نے اگلا سوال پوچھا "تو یہ راجن۔ یہ پارو سب فن کار نہیں"؟

پنڈت جی کا جواب صاف تھا "میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں ان کا نوکر ہوں۔ میرے افلاس نے میرا فن اور اس فن کی عظمتیں چند سکوں کے عوض اُن کے ہاتھوں بیچ دی ہیں"۔

انجنا یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔ "میں بہت کچھ سمجھ گئی ہوں پنڈت جی"۔

اور پھر اُسی رات کو نادر گردن سیٹھ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں جب اس نے دیکھا کہ کام رنگی ناچ میں ایک نئی چھوکری انجنا کس شان سے ناچی ہے۔ پارو کی قیمت اس کی نگاہوں میں گھٹ گئی۔ چند ہی دنوں بعد۔ گوداوری کے کنارے۔ جب پارو کی پارٹی پک نک کے لیے گئی ہوئی تھی۔ سیٹھ کے خیمے میں وہی کام رنگی ناچ ہوا۔

رات کو انجنا کے لیے سیٹھ کا بلاوا آ گیا۔ وہ نہ گئی۔ اپنے خیمے میں اکیلی ہی بیٹھی رہی۔ سیٹھ کا نوکر تین دفعہ آکر لوٹ گیا۔ چوتھی دفعہ سیٹھ اس کے خیمے میں خود آیا۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ شراب کی بھبک اس کے منہ سے ابل رہی تھی۔

وہ آتے ہی گرجا "تم کیوں نہیں آئیں"؟

انجنا اپنی چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور بولی "معاف کیجیے گا۔ میں آپ کی ملازمہ نہیں ہوں۔ پارو کی سہیلی ہوں"

سیٹھ کڑکا "تو کیا ہوا"

انجنا کی آواز میں متانت تھی جب اس نے کہا "آپ مجھ سے کوئی اُمید نہ رکھئے۔" سیٹھ جھنجھلایا۔ "کیسے نہ رکھوں میں تم سے اُمید ـــــ تم اتنی خوبصورت کیوں ہو" اتنا کہتے کہتے وہ انجنا کی طرف لپکا ہی تھا کہ راجن اچانک اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ پارو بھی خیمے میں آ گئی تھی اور قہقہے لگا کر ہنس رہی تھی۔

سیٹھ اور راجن ایک دوسرے سے اُلجھنے ہی والے تھے کہ پارو راجن کو ڈانٹتے ہوئے بولی۔ "کچھ نہ کہو میرے راجہ کو" ـــــ اور وہ نشہ میں متوالے سیٹھ کو سمجھا بجھا کر اپنے خیمے میں لے گئی۔ راجن انجنا کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا۔

انجنا غم و غصّہ سے پاگل ہو رہی تھی۔ وہ دانت بھینچتے ہوئے بولی۔ "یہی ہے فن اور فن کی عظمت ہندوستان میں ـــــ؟"

راجن نے کہا "غریبی گناہ ہے اور غریبوں کا فن بھی گناہ ہے۔ ان کے فن کار بھی گنہگار ہیں۔"

فن کو اپنانے والے یہ بڑے بڑے لوگ۔ ان میں سے اکثر فن کو کتنا سمجھتے ہیں، یہ مجھے معلوم ہے۔ یہ پارو کو بھی معلوم ہے۔ مگر اس کی زبان کو

طلائی سکوں نے جکڑ دیا ہے۔ ان قدر شناسوں کے دلوں کی گہرائیوں میں کتنے خونی ارادے پنہاں رہتے ہیں۔ یہ میرے تجربے کی سسکیاں ہی بتا سکتی ہیں۔"

انجنا کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس کا لہجہ بہت ترش تھا۔ جب اس نے کہا۔

"تو فنکار کیوں نہیں خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتے۔ خود غرضوں کے روپے سے آرٹ کو کبھی بھی زندہ نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ فن کی رُوح فریب کے سانچے میں ڈھل کر اپنی لطافت کھو بیٹھے گی۔"

راجن نے انجنا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "کتنے بلند خیالات ہیں تمہارے انجنا" "کاش میرے پاس روپیہ ہوتا۔ تو میں تمہارے خوابوں کو حقیقت کا جامہ پہنا دیتا۔"

انجنا نے قدرے سختی سے کہا۔ "ہر چیز کا علاج محض روپیہ ہی نہیں۔ روپیہ تو ایک نتیجہ ہے کسی جدوجہد کا۔ اصل چیز جدوجہد ہے۔ کیوں نہیں اپنے آپ کو فنکار کہلانے والے اس بات کے لئے جدوجہد کرتے۔ کہ وہ فن شناسی کا ایک ایسا صحیح میدان تیار کریں۔ جس میں لوگوں کی نگاہیں فنکاروں کی ذات سے ہٹ کر فن کے معیار اور اس کی ترقی کی طرف مائل ہو جائیں۔"

راجن نے کہا۔ "آپ کے نزدیک ہے کہ مجھے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو میری اُلجھنوں کا صحیح حل ہیں۔"

انجنا نے پُوچھا۔ "اور یہ معلوم ہونے کے بعد بھی آپ خاموش بیٹھ جائیں گے؟"

راجن نے اپنی بات کو ہر لحاظ سے پختہ بناتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ کو کیسے خیال ہوا۔ کہ میں خاموش بیٹھ جاؤنگا" اور یہ کہتے کہتے راجن نے انجنا کے کندھے سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اور اپنی انگلیاں اس کے سر کے بالوں میں اُلجھا دیں۔ کچھ دیر تک مبہوت انجنا خاموش رہی اور پھر اس نے پوچھا۔ "اس وقت بارو کہاں ہے؟"

راجن نے جواب دیا۔ "سیٹھ کے ساتھ مزے کر رہی ہوگی"

انجنا نے پوچھا۔ "اور اس پر بھی وہ اپنے آپ کو فن کار کہلاتی ہے"

راجن نے جواب دیا۔ "جی ہاں"

انجنا نے کہا۔ "اور اس پر دعوے ہے جے شنکر اور کرشن گوپال کی ہمسری کا ــــــ؟"

راجن نے کہا۔ "یہ ڈھونگ نہ رچے تو سیٹھ کا پیسہ کیسے ملے" اور پھر وہ انجنا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہوا بولا۔ "جب تک آپ جیسی دیویاں فن کی ترقی کا بیڑا نہیں اٹھائیں گی"

اور انجنا یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں ابھی آتی ہوں"

بوڑھے پنڈت جی کے خیمے میں آتے ہی وہ گڑگڑا اٹھی۔ "پنڈت جی! میں بہت پریشان ہوں۔ بڑی مشکل ہے میں نے اپنے آپ کو سیٹھ کے چنگل سے چھڑایا ہے۔ اب راجن میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہے"۔

پنڈت جی بھونچکے رہ گئے۔ وہ بولے۔ "انجنا! میری صلاح ہے تم یہاں سے چلی جاؤ۔ گھر لوٹ جاؤ بیٹی۔ وہ سادہ زندگی حقیقت ہے۔ اس

دنیا کی چکا چوند کے فریب سے نکل جاؤ۔ جتنی جلدی ہو سکے نکل جاؤ۔"
انجنا گھر واپس لوٹ رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ انجنیئر صاحب واقعی ایک آئیڈیل شوہر ہیں۔

دُنیا کتنی مکّار ہے۔ وہ پارو کیا معصوم سا نام ہے اور کیا کافرد ن جیسے اعمال ــــ دھڑ سونے کا اور پیر پیتل کے۔ پھوٹ گئے نصیب۔ بس سمجھی تھی فن کی کوئی بڑی بھاری پجارن مل گئی ہے۔ کھودا پہاڑ نکلی مری ہوئی چوہیا کی سڑی ہوئی دُم ــــ پاؤڈر اکھاڑو تو مراد آبادی نقاشی والا چیچک کے داغوں سے بھرا ہوا آبنوسی چہرہ اور اس کو پھر کھرچو تو نیچے کالی سیاہ رُو۔ ــــ عورت کیا ہے بھان متی کا پٹارا ہے۔ اور وہ راجن کتنا عیار ہے۔ کیسا مکّار ہے۔ کوئی سمجھ سکتا ہے کہ اس کا ایک ایک سانس فن کے لئے وقف نہیں ہے۔ باطن میں میاں پورا چھندر ــــ عورت دیکھی نہیں کہ بگلا بن کر بیٹھ گئے۔ کچھ بچی تو اصلی روپ میں آ گئے۔ اور اگر اکڑی تو اپدیش دینے لگ پڑے۔ بہروپیا کہیں کا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ڈائن بھی ایک گھر چھوڑ دیتی ہے۔ مگر یہ وہ ہیں کہ جو پہلے گھر پر ہاتھ صاف کر کے باہر نکلتے ہیں۔ اور وہ کوتاہ گردن سیٹھ۔ ان کا تو پیشہ ہی یہ ہے اور انجنیئر صاحب۔ ان کی مین میکھ ــــ ان کے وشا شول اور مونگے کے نگ کے پیچھے کتنا خلوص تھا۔ کتنا پیار تھا۔ وہ آنکھوں میں جل لئے۔ اس دل میں نیا سنسار بسائے میری راہ تک رہے ہوں گے۔

وہ گھر پہنچ گئی۔ مکان کے اندر داخل ہوتے وقت اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ برآمدے میں کرسیاں ویسے ہی پڑی تھیں۔ ڈرائینگ روم میں وہی

صوفہ سیٹ۔ وہی ریڈیو۔ وہی میز۔ ویسے ہی آراستہ تھے۔ دیواروں پر تصویریں بھی وہی تھیں۔ سونے والے کمرے میں اس کا پلنگ۔ جُوں کا تُوں لگا تھا۔ نوکر بھی وہی تھا۔ اس کی نگاہوں میں وہی وفاداری اور خوف کے وہی جذبات تھے۔

یہ سب چیزیں جانی پہچانی ہونے کے باوجود انجنا کی نگاہیں ان تازہ تازہ کرنوں سے منور ہوتی جا رہی تھیں۔ جو اس کے پرانے گھروندے کے ذرّے ذرّے سے پھوٹ رہی تھیں۔ اس نے صوفے پر بیٹھتے ہی نوکر سے پُوچھا "صاحب کتنے بجے دفتر گئے ہیں؟"

نوکر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "وہ دفتر نہیں گئے ہیں"!

انجنا اس کے مُنہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی نگاہوں میں تیرنے والا سکون مدھم پڑ گیا۔ نوکر پھر بولا "وہ پھر آج آپ ہی کو تلاش کرنے گئے ہیں۔ کچھ روز ہوئے۔ وہ آپ کو ملنے کھنڈوا گئے تھے۔ وہاں سے لوٹ کر آئے۔ تو ان کی شکل ہی بدلی ہوئی تھی۔ مجھے کہنے لگے۔ ہری! میری دُنیا لٹ گئی ہے۔ میں کہیں کا نہیں رہا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ انجنا جی کی نفرت پھر ایک نہ ایک دن محبت میں تبدیل ہو جائے گی۔ مگر نہیں وہ دیوی تھیں۔ وہ جو کہتی تھیں کر کے دکھا دیتی تھیں وہ مجھ پر ترس کھا کر مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو گئی تھیں۔ ان کے اور میرے ماں باپ شادی کے خلاف تھے۔ مگر ان کی جرأت اور تپسیا نے سب الجھنوں کو مٹا دیا۔ ہماری شادی ہو گئی۔ اب نہ جانے وہ کہاں چلی گئی ہیں۔ آج وہ کہہ رہے تھے۔ ہری! اب تک ضرور وہ کھنڈوا پہنچ گئی ہوں گی ۔۔۔ دن رات وہ جوتش کی موٹی موٹی کتابوں میں آپ ہی کو تلاش کرتے رہتے ہیں"۔

انجنا کی پلکوں پر موتی کانپنے لگے۔ ہری پھر بولا "کچھ دن تو وہ بہت اداس رہے۔ انہوں نے دفتر سے چھٹی لے لی —— آج وہ اچانک ہی پھر کھنڈ وہ چلے گئے ہیں ——"

اب انجنا اُداس تھی۔ ہر چاپ پر اُسے نرمل کے قدموں کی چاپ کا گمان ہوتا تھا۔

ایک دن وہ اپنے پلنگ پر نڈھال لیٹی تھی کہ آندھی کی طرح نرمل کمرے میں داخل ہوا۔

انجنا گھبرا سی گئی۔

نرمل نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "تم آگئیں انجنا!"

انجنا خاموش تھی۔

نرمل نے پھر پوچھا "اب تو اس طرح نہ جاؤ گی انجنا؟"

انجنا کی پلکوں سے ستارے ٹوٹنے لگے۔ نرمل یک لخت اداس ہو گیا۔ انجنا نے اپنے الفاظ کو بمشکل تمام ہچکیوں سے بچاتے ہوئے کہا "میں اب کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں نے بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔"

مگر نرمل پھر بھی اُداس تھا۔

انجنا نے صوفے سے اٹھ کر نرمل کے پاؤں پکڑ لئے۔ اس کی آنکھیں موتی برسا رہی تھیں۔ وہ بولی "میرا قصور معاف کر دیجئے۔ اب آپ کو مجھ سے کوئی تکلیف نہ ہوگی"۔ نرمل کی اُداسی دُور نہ ہوئی۔

انجنا نے اصرار کیا "کہیئے نا کہ آپ نے میری خطائیں معاف کر دیں؟"

اس بار نرمل گھبرا سا گیا۔ وہ انجنا کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو صوفہ پر بیٹھو۔"

انجنا صوفے پر بیٹھ گئی۔

نرمل بڑی گھمبیر آواز سے بولا۔ "تمام جوتش غلط ہو گئی ہے۔ پرشن کنڈلی کے حساب سے تمہیں اس وقت ہردوار ہونا چاہیئے تھا۔" انجنا کے لبوں پر لطیف سی مسکراہٹ چھا گئی۔

نرمل کے چہرے پر بچوں جیسی معصومیت آ گئی۔ وہ چٹکی بجاتا ہوا بولا۔ "سودا مہنگا نہیں بہت سستا ہے۔ بلکہ یہ سودا ہی نہیں بھگوان کی دین ہے۔ جوتش چلی گئی۔ تم آ گئیں۔"

بُت مُسکرا رہا تھا

رات کسی مفلس کے خوابوں سے بھی زیادہ تاریک تھی۔ ہوائیں سسکیاں بھر رہی تھیں۔ اس کمرہ میں مرمریں بُت کے چہرہ پر گھی کے ایک بڑے سے چراغ کی لَو کا تھرتھراتا ہوا پرتو زندگی کے آثار پیدا کر رہا تھا۔ راکیش کی نگاہیں بُت کی پیشانی پر گڑی ہوئی تھیں۔ مرمریں بت کے حضور میں ایک انسانی بت خاموش و ساکت کھڑا تھا۔ یکسوئی کے پروں پر پرواز کرتا کرتا راکیش کا دماغ کہیں سے کہیں پہنچ چکا تھا۔ احساسِ تنہائی اس کی رُوح کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کر رہا تھا اور اب اس کا شعور زندگی کی تلخ حقیقتوں سے نگاہیں ملا کر بیتے واقعات کا جائزہ لیتے ہوئے کانپ رہا تھا۔ وہ اتنی بڑی دُنیا میں تنہا تھا۔ زندگی کے لق و دق صحرا میں اس درخت کی مانند تنہا جس کی بہار بِنا داو لِئے بیت جاتی ہے اور جس کی خزاں پر کوئی آہ تک نہیں بھرتا۔ غم انگیز خیالات اس کے ذہن سے اُبھر کر اس کی اپنی شخصیت پر ترس کھانے لگے تھے ـــــ وہ سوچ رہا تھا۔ کتنا بد قسمت ہوتا ہے اکلوتا بیٹا۔ ماں باپ اس کے لبوں پر تبسم کی ایک مدھم سی کرن دیکھنے کے لئے کیا کچھ نہیں نثار کر دیتے۔ کتنی قربانیاں

وہ آتے دن دیتے رہتے ہیں۔ اپنے نونہال کے جیون کو دلکش بنانے کے لئے۔ مگر تقدیر کے ہاتھ کا تازیانہ اس دلکش بہار کو ایک ہی ضرب سے کتنی ہولناک خزاں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اکلوتا بیٹا سالہا سال تک اپنے والدین کے لاڈ اور پیار کے نشہ میں اپنے فرض سے بے خبر مستی اور بے فکری کے ایوانوں میں جھومتا رہتا ہے۔ مگر جب سنجیدگی کا نکھار اُسے اس کے فرائض کی یاد دلانے لگتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اپنے ماں باپ کی محبت کا بدلہ اپنی سعادت مندی سے ادا کرے تو ـــــ وہ اسے چھوڑ کر پرلوک سدھار جاتے ہیں۔ اسے محسوس ہُوا۔ کہ اس کے والد کی بتّ کی نگاہوں میں کچھ نمی سی آگئی ہے مگر اس کا شعور یکے بعد دیگرے ابھرنے والے خیالات کے حلقوں کو جوڑتا چلا جا رہا تھا۔

پتاجی اس دن حسب معمول دفتر سے آئے۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد انہوں نے ہاتھ منہ دھو کر اسے بلایا اور اپنے قریب ہی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ کچھ دیر اس کے چہرے کی طرف کھوئی کھوئی نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ بولے "راکیش! تمہارا چہرہ بڑا اترا اترا رہنے لگا ہے۔ اپنی صحت کا بھی خیال کرو۔ ہم ایسی پڑھائی سے باز آئے"۔ اتنا کہتے کہتے وہ اپنے خیالات کی دنیا میں گم ہو گئے۔ ان کی سونی سونی نگاہیں اور بھی گھٹ گئیں۔ چھ سات مہینے سے ان کے مزاج میں ایک عجیب تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔ اب ان میں وہ غصہ نام کو بھی نہ رہ گیا تھا۔ جب ان کی ایک گرج سے مکان کے در و دیوار ہلنے لگتے۔ اب تو وہ شام کو سیر سے بھی جلد ہی واپس آجاتے تھے۔ صبح و شام کی ریاضتِ الہی کا وقت دُگنا کیا سہ گنا ہو چکا تھا ـــــ اکثر وہ اس کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے لگتے اور

پھر اچانک ان کی پلکیں بھیگ جاتیں اور وہ کسی سے نگاہیں بچا کر یا تو دوسرے کمرے میں چلے جاتے یا کوئی کتاب اٹھا کر اس کی آڑ میں اپنے آنسوؤں کو پی جاتے۔ ایک دن اس نے حوصلہ کر کے پوچھ ہی لیا تھا "پتا جی! آپ بہت اداس رہنے لگے ہیں"۔ ان کی آواز اتنی گھمبیر اور اتنی گہری تھی کہ وہ ڈر سا گیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا۔ "راکیش جب شام کو سیر کرتے وقت میں تمہارے جیسے کسی لڑکے کو دیکھتا ہوں تو نہ جانے میرا من کیوں بھر آتا ہے اور پھر میرا دل مجھ سے اصرار کرنے لگتا ہے کہ میں تمہیں اس سال پڑھنے کے لئے الہ آباد نہ جانے دوں۔ تم میرے پاس ہی رہو۔ نہ جانے مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ ——— ممکن ہے یہ میری موت کے آثار ہوں۔ مرنے سے پہلے ہر انسان کے مزاج میں کوئی نہ کوئی تبدیلی آ ہی جاتی ہے!" یہ کہتے کہتے اس نے اچانک دیکھا تھا کہ ان کی آنکھیں موتیوں سے بھر گئی تھیں۔ اور قریب ہی بیٹھی ہوئی اس کی ماں کی پلکوں سے بھی ستارے ٹوٹنے لگے تھے اور اس نے بمشکل تمام اپنے آنسو پیتے ہوئے کہا تھا۔ "پتا جی میں اس سال یونیورسٹی نہیں جاؤنگا۔" اور پھر انہوں نے اپنے گرتے ہوئے حوصلوں کو سنبھال لیا تھا۔ وہ اپنے مرجھائے ہوئے لبوں پر تبسم دھکیلنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے تھے "نہیں راکیش تم ضرور یونیورسٹی جاؤ۔ یہ تو میرا پاگل پن ہے۔ دیکھتے نہیں ہو میں بھلا چنگا ہوں"

اُس نے بھی سوچا تھا۔ پتا جی بھلے چنگے ہیں۔ شاید یہ خیالات ہلکے سے ہائی بلڈ پریشر کی دین ہیں۔ مگر دو تین دن کے بعد ہی ایک ملگجی سی شام کو اس کے پتا نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا تھا "اب آج سے چائے پینا بند

کر دونگا۔ دل میں گرانی پیدا کرتی ہے"۔ اور پھر یک لخت وہ لڑکھڑاتے ہوئے گھٹی گھٹی آواز سے چلا پڑے تھے"۔ "کیش! پانی کا گلاس لاؤ۔ جلدی لاؤ"۔ اور وہ پانی لینے کے لئے باورچی خانہ کی طرف لپکا تھا۔ اس کا داہنا گھٹنا بھی برآمدہ میں رکھے ہوئے گلدان سے اُلجھ کر زخمی ہو گیا تھا۔ جس وقت وہ پانی لے کر واپس پہنچا۔ اس کے پتا جی بھگوان کے پاس پہنچ چکے تھے۔ ان کی آنکھیں آدھی کھلی ہوئی تھیں۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ ان کے قلب کی حرکت بند ہو چکی ہے۔ پھر بھی اس نے پانی کا گلاس ان کے ہونٹوں سے لگا دیا تھا۔ مگر جب پانی ان کے حلق میں اترنے کی بجائے ہونٹوں سے ٹکرا کر ان کے سینہ پر بہہ نکلا۔ تو وہ گلاس زمین پر رکھ کر ان کے گلے سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر اس وقت تک روتا رہا تھا جبتک اس کی ماں نے اپنے آنسو پی کر اس کو اپنی آغوش میں لے کر خاموش نہیں کرا دیا تھا۔

اور پھر دریا کے کنارے مغموم ریت کے ذرّوں پر ایک چتا بھڑک اٹھی تھی۔ اس کے شعلوں کی لپک میں اس کی ماں کی چوڑیوں کے ٹوٹنے کی صدا پیوست ہو گئی تھی۔

اس نے اپنے مرحوم باپ کی سینکڑوں تصویریں بنوا ڈالیں۔ جب تک وہ تصویریں فوٹو گرافر کے یہاں ہوتیں وہ کتنی حسین اور جاذبِ توجہ ہوتیں۔ مگر جب وہ اسے مل جاتیں اس کا اشتیاق پھیکا پڑ جاتا۔ اور پھر نئے پوز بنانے کی فرمائش لے کر وہ نوٹو گرافر کے اسٹوڈیو میں جا پہنچتا۔ بالآخر جب اس نے محسوس کیا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ فوٹو گرافر بھی اس کے شوق کو مطمئن نہ کر سکیں گے۔ اُس نے شہر کے سب سے مشہور بُت تراش سے اپنے مرحوم والد کا یہ بُت بنوا لیا تھا۔

عموماً جب رات کافی بھیگ چکی ہوتی۔ جذبات تنہائیوں کے وسیع خلا میں ہوکیں بھرنے لگتے۔ وہ بت کے حضور میں تسکین کا مرہم مانگنے کے لئے آ کھڑا ہوتا۔

آج بھی وہ اس بت کے حضور میں خاموش کھڑا تھا۔ اس نے دیکھا بت کی پلکوں پر نمی کی جگہ آنسو ہیں۔ وہ آنسو اب سیاہ چبوترہ پر ٹپک ٹپک کر بکھر رہے ہیں وہ خاموش کھڑا رہا نہ جانے کب تک……

چاند کا چہرہ اداس تھا۔ ستارے کسی برباد تمنا کی اجڑی ہوئی امیدوں کی طرح سسک رہے تھے۔ ہوائیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ نازک اندام پودے تھرتھرا رہے تھے۔ کوسوں تک ساحل پر بکھرے ہوئے ریگ کے ذرات کسی زہریلی غنودگی کے زیر اثر اونگھ رہے تھے۔ گنگا کے مہیب قہقہے ماحول کے پُرہول سکوت میں ہولناکیاں بھر رہے تھے۔ آسمان پر کالی گھٹاؤں کے سیاہ قلبوں سے ایک لا متناہی گرج ابھر رہی تھی۔ اس اونچی سی دراڑ کے پاس قد آور بڑ کا درخت دھندلکے کی سیاہی میں کسی تنومند ہیکل دیو کی طرح لمبی لمبی ٹہنیوں سے اپنا سینہ پیٹ رہا تھا۔ گنگا کے ادھر سرکنڈوں کی جھاڑیوں میں درجنوں گیدڑ رو رہے تھے۔

رینو کا ہوش میں آ چکی تھی اور راکیش اپنے بھیگے ہوئے دامن کو نچوڑتا ہوا اس کے چہرے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ سر سے پاؤں تک بھیگی ہوئی رینو کا سر جھکائے اسی چٹان کا سہارا لئے بیٹھی تھی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ اس کے دانت بج رہے تھے۔ اس کا احساس تک سرد ہو چکا تھا اور اب اس کی ٹھٹھرتی ہوئی انگلیوں میں اتنا دم نہیں رہ گیا تھا کہ وہ اپنے کپڑوں کو نچوڑ سکے۔

راکیش نے پوچھا "آپ گنگا میں کیسے گر گئی تھیں؟"

رینوکا نے کوئی جواب نہ دیا۔

راکیش نے اپنے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔"کتنی سنسان جگہ ہے یہاں تو کہیں آگ بھی نہ ملے گی"۔

رینوکا خاموش رہی۔

راکیش جھنجھلا سا گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ رینوکا کچھ بولے۔ مگر رینوکا کی قوتِ گویائی بھی شاید شل ہو چکی تھی۔

راکیش بڑبڑایا "میں یہاں ہر روز شام کو سندھیا کرنے آتا ہوں۔ بجلی کی لپک میں میں نے دیکھا کہ آپ لہروں سے الجھ رہی ہیں۔ شاید پانی میں گرے آپ کو تھوڑا ہی وقت ہوا تھا"۔

اس بار رینوکا راکیش کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ "مجھے جہاں جانا ہوگا میں چلی جاؤں گی"۔

راکیش پہلے تو خاموش رہا۔ مگر پھر اس نے کچھ سوچتے سوچتے پوچھا "کہاں چلی جائیں گی آپ"؟

رینوکا بڑبڑائی۔ "واپس انہیں لہروں میں"۔

متعجب راکیش ایک دم بول اٹھا۔ "تو آپ خودکشی کر رہی تھیں"؟

رینوکا نے بےباکی سے کہا۔ "جی ہاں"۔

راکیش کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی زندگی میں آج تک کوئی بھی لڑکی نہیں آئی تھی اور آج پہلی بار اس کا واسطہ ایسی لڑکی سے ایسے عجیب اور پُراسرار ماحول میں

آہ ہم تھا۔ اس کی سوچ اُلجھنے لگی۔

رینوکا نے پھر راکیش کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پُوچھا۔ "آپ میری خودکشی کی وجہ پُوچھنا چاہتے ہونگے؟"

راکیش کے چہرے پر بھولے بھالے سے جذبات اور اس کے لہجہ پر سادہ سی بے قراری طاری ہو گئی۔ گویا کسی بچے کو اس کی پسند کا کھلونا نظر آ گیا ہو۔ وہ بولا۔ "جی ہاں میں پوچھنا تو یہی چاہتا ہوں۔"

رینوکا نے راکیش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹھ جائیے۔"

راکیش رینوکا کے قریب ذرا ہٹ کر بیٹھ گیا۔ رینوکا کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ وہ بولی "آپ نے مجھے بازوؤں پر اٹھا کر گنگا سے نکالا ہے۔ اب آپ ڈر کیوں رہے ہیں۔ میں لڑکی ہوں محض لڑکی۔ اور ہم لڑکیاں پہلی نظر میں سمجھ لیتی ہیں کہ کون مرد خطرناک ہے کون نہیں۔ جب میں آپ سے نہیں ڈر رہی ہوں تو آپ مجھ سے کیوں گھبرا رہے ہیں"۔

رینوکا کی بے باکی نے راکیش کی جرأت میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ وہ بغیر کچھ کہے سُنے رینوکا کے قریب کھسک آیا۔ رینوکا نے بھیگے ہوئے بالوں کو پُشت کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "ہاں تو آپ یہی کہیں گے کہ میں اتنا بڑا پاپ نہ کروں۔ آتم ہتیا کا گناہ بھگوان کبھی معاف نہیں کرتا۔ انسان کو ہر مصیبت کا سامنا ڈٹ کر کرنا چاہیئے۔ زندگی بھاگ کھڑا ہونے کا نام نہیں ہے۔ یہ سب کچھ پتا جی بھی کہا کرتے ہیں۔ محلہ والے بھی یہی اُپدیش دیتے ہیں۔ آپ اگر اس کے علاوہ کچھ کہنا چاہتے ہیں تو کہیئے۔"

راکیش سونی سونی نگاہوں سے رینوکا کے چہرے کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ خشک گھونٹ بھرتا ہوا بولا۔ "آپ سب کچھ تو سمجھتی ہیں۔ مگر میں یہ پُوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ

پر کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے جو آپ زندگی جیسی قیمتی چیز کو پانی میں بہا ڈالنے کا فیصلہ کر بیٹھی ہیں"۔ رینوکا نے اپنے بازو راکیش کے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔

"دیکھئے میرے بازوؤں میں چوڑیاں نہیں ہیں"!

راکیش جلدی سے بول اُٹھا۔ "میں سمجھا"!

رینوکا نے بھی اتنی ہی جلدی سے کہا "آپ کچھ بھی نہیں سمجھے ہیں۔ میں ودھوا نہیں ہوں"۔

راکیش اور بھی حیرت زدہ ہو گیا۔

رینوکا بولی "میرے پتی دیو زندہ ہیں ——— اس وقت کیا وقت ہو گا"؟

راکیش نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "دس بج چکے ہونگے"!

رینوکا بولی "تو اس وقت وہ سندھیا بھجن کر کے کھانا وانا کھا کر سو چکے ہونگے"!

راکیش نے کہا "تب تو وہ بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں"۔

رینوکا نے کہا "جی ہاں۔ ان کی شرافت کا لوہا دنیا مانتی ہے۔ مگر میرے لئے یہی شرافت ایک مصیبت ہے۔ وہ اتنے کٹھور شریف ہیں کہ مجھے ایک رنڈی سمجھتے ہیں۔ مجھے بچپن سے پتا جی نے سنگیت اور ناچ سکھائے ہیں۔ میں نئی نئی کتابیں پڑھنا چاہتی ہوں۔ مجھے اچھی تصویریں اچھی لگتی ہیں۔ میں کسی بھی غیر معقول بات کا جواب فوراً دے بیٹھتی ہوں۔ مجھے سیر کا شوق ہے، اور میرے پتی دیو کی نگاہوں میں یہ سب چلن ایک رنڈی کے ہیں"۔

راکیش خاموش رہا۔

رینوکا نے پوچھا۔ "آپ کیا سمجھتے ہیں میری عمر کیا ہو گی"؟

راکیش اندازہ لگانا ہی چاہتا تھا کہ رینو کا بول اٹھی "عورتوں کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ میری عمر کل اکیس سال کی ہے۔ میری شادی جب میں سولہ سال کی تھی ہو گئی تھی۔ میرے پتی دیو کو مجھ سے ایک شکایت یہ بھی ہے کہ ابھی تک میرے کوئی بچہ کیوں نہیں ہوا۔"

راکیش خاموش رہا۔

رینو کا پھر بولی "وہ میری چیزیں جو کسی بھی سمجھ دار انسان کو پسند آ سکتی تھیں۔ میرے پتی دیو کی نگاہوں میں حقارت پیدا کرتی چلی گئیں۔ میں نے ناچنا بند کر دیا۔ گانا گائے تو مجھے برسوں گذر گئے ہیں۔ کتابیں ملتی ہی نہیں۔ زندگی جہنم بن گئی ہو تو سیر کیسے سوجھتی ہے۔ مگر پھر بھی میں پتی دیو کی خوشنودی حاصل نہ کر سکی۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ اجنبی لڑکوں کو دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچنے لگتی ہے۔ اور تو اور انہیں اپنے بھتیجے ہی پر شک ہو گیا ہے۔ حالانکہ وہ غریب مجھے اپنی چچی نہیں ماں سمجھتا ہے۔"

راکیش خاموش رہا۔

رینو کا پھر بولی۔ "تین دفعہ میرے پتی دیو نے مجھے گھر سے نکالا۔ پتا جی ان کے ہاتھ پاؤں پڑ کر مجھے پھر سسرال میں بسا آئے۔ سات مہینے ہوئے۔ مجھے پھر گھر سے دھکا دے دیا گیا۔ مجھ پر ہر قسم کا الزام لگایا گیا۔ اور جس دن پتی دیو نے اپنی فراخ دلی کا ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے میرے پتا جی کو خط لکھا کہ رینو کا سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ چاہے تو دوسری شادی کر سکتی ہے مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اس کے چوتھے روز ہی پتا جی کا جواب لئے بغیر میرے پتی دیو بارات سجا کر دوسری نئی دلہن لے آئے۔

دنیا ان کا یقین کرتی ہے۔ وہ صبح اُٹھتے ہی سندھیا کرتے ہیں۔ اپدیشوں میں شریک ہوتے ہیں۔ شام کو جلد گھر آجاتے ہیں اور یہ کسی کو بھی معلوم نہیں کہ ان کی شادی جس لڑکی سے اب ہوئی ہے۔ اُس سے ان کا پریم تین برس سے چل رہا تھا۔"

راکیش خاموش رہا۔

رینوکا آگے بڑھی۔ "دُنیا نے فتوے دے دیا کہ رینوکا بدچلن ہے۔ میرے پتا جی کو محلہ میں باہر نکلنا مشکل ہو گیا۔ وہ اداس رہنے لگے۔ میں نے کتنی ہی جگہ ملازمت کرنی چاہی۔ کتنی ہی کنیا پاٹھ شالاؤں کے دروازے کھٹکھٹائے مگر نہ جانے کیسے میرے چرچے میرے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں موجود ہوتے۔"

راکیش نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے پُوچھا۔ "آپ کیا سمجھتی ہیں کہ اس ظالم سماج نے محض آپ ہی کو اپنا شکار بنایا ہے؟"

رینوکا نے اعتراف کیا۔ "نہیں مجھ ایسی اور بھی کئی بدقسمت لڑکیاں ہونگی۔"

راکیش نے کہا۔ "تو آپ انہیں کیا سوجھاؤ دیتی ہیں کہ وہ بھی اپنی زندگیاں گنگا کے حوالے کر دیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو ہمالہ سے کلکتہ تک گنگا میں سوائے لاشوں کے پانی تو کہیں دکھائی نہیں پڑے گا۔"

اب رینوکا خاموش تھی۔

راکیش بولا۔ "آپ چاہتی ہیں کہ سماج کو اندھیرے میں رکھنے والے خودغرضوں کی فتح ہو۔ ان کے جملوں کا جواب خودکشیوں سے دے کر انہیں اتنا طاقتور بنا دیا جائے کہ آزادی کا پنچھی اڑنے کا خیال تک دماغ میں نہ لا سکے۔"

رینوکا گڑگڑائی۔ "میں عورت ہوں۔ اکیلی رہی اور کتنی کمزور ہوں۔"

راکیش سوچتے سوچتے بولا۔ "میں بھی کبھی اپنے آپ کو تنہا سمجھتا تھا اور یوں تو میں اب بھی تنہا ہی ہوں۔ گھر پر سوائے ماں کے اور کوئی نہیں ہے۔ مگر میرے شعور نے مجھے سکھایا ہے کہ تنہائی کا احساس بھی بھاگ کھڑے ہونے کا دوسرا نام ہے"!

رینوکا کی آواز بڑی گمبھیر تھی۔ "آپ بھی مجھے پناہ نہیں دے سکیں گے۔ سماج مظلوم کو ختم کرنے سے پہلے مظلوم کو پناہ دینے والے پر حملہ کرتا ہے"!

راکیش کے لہجہ میں عزم کی پختگی تھی۔ جب وہ بولا۔ "مجھے کسی بھی حملے کا خوف نہیں ہے۔ میں جب تک آپ میں سچائی دیکھونگا آپ کے لیئے ہر مصیبت کا سامنا کرونگا۔ آپ چلیئے میرے ساتھ ——"

راکیش کے پر خلوص اصرار نے رینوکا کو خودکشی سے بچا لیا!

اسی رات کو راکیش اپنے پتا کے بت کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے دیکھا بت کی نگاہوں میں چمک ہے۔ اس کے لبوں پر تبسم ہے۔ اس کے چہرے کی لکیروں پر جذبات کی ایک عجیب سنجیدگی انگڑائی لے رہی ہے۔

سماج کی اصلاح کے جذبے سے متاثر ہو کر راکیش نے ایک آشرم کھول لیا۔ چند ہی دنوں میں کافی رضاکار جمع ہو گئے۔ بے لوث خدمت اور برائیوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا آدرش لے کر راکیش آگے بڑھ رہا تھا۔ رینوکا اپنے پتا کی اجازت لے کر اب اس آشرم ہی میں رہنے لگی تھی۔

ڈاکٹر کا کہنا تھا۔ کہ ننھے چمار کے لڑکے کے جسم میں اگر خون نہ داخل کیا گیا۔ تو وہ مر جائے گا موٹر کے نیچے آجانے سے اس کے جسم کا تین چوتھائی خون خاک

میں مل چکا تھا۔ ضلع کے بلڈ بنک کی کسی بھی شیشی کا خون ننھے کے بیٹے کے خون سے نہ مل رہا تھا۔ راکیش کے آشرم میں بھی خبر پہنچی۔ وہ ننھے کے یہاں جا پہنچا۔ اس کے خون نے ننھے کے بیٹے کی جان بچالی۔

راکیش نے دیکھا کہ آج اس کے والد کا بت اپنے پتھر کے جسم سے مجبور ہے۔ ورنہ وہ چبوترے سے اُتر کر اُسے گلے سے لگا لیتا۔ کمرے میں نام کو بھی کوئی پھول نہ تھا۔ مگر راکیش کا دماغ پھر بھی کسی بھینی بھینی خوشبو سے معطر ہو رہا تھا۔ فرطِ عقیدت سے وہ بُت کے گلے سے لپٹ گیا۔

چند دنوں سے رینوکا اداس تھی۔

راکیش نے روٹی کا نوالہ توڑتے ہوئے کہا۔ "آج بہت تھک گیا ہوں۔ رینوکا! کتنا بزدل ہوتا ہے انسان۔ ذرا سی پلیگ پھیلی۔ لوگ اپنے مُردوں تک کو بے کفن چھوڑ کر بھاگنے شروع ہو گئے ہیں۔"

قریب بیٹھی ہوئی رینوکا نے کہا۔ "ہاں کتنا بزدل ہوتا ہے انسان"۔

راکیش رینوکا کے لہجے کی خنکی کو محسوس کرتے ہوئے بولا۔ "تم آج بہت اداس نظر آتی ہو"۔

رینوکا کے چہرے پر کسی بھی جذبہ کا اظہار نہ تھا۔ وہ بولی۔ "ہاں آج میں بہت اُداس ہوں"۔

راکیش نے روٹی چھوڑ دی۔ وہ بولا۔ "چلو چھت پر چلیں"۔

دونوں ہی کو چھت کے تخلیہ نے گفتگو کا موقع دیا۔
راکیش نے پوچھا۔ "رینوکا! تمہیں بتانا ہی ہوگا"
رینوکا نے راکیش کے چہرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا بتانا ہوگا؟"
راکیش نے کہا۔ "یہی کہ جس مقصد کے لیئے بھگوان نے تمہیں ڈوبنے سے بچایا ہے۔ کیا تم اس کی اہمیت کو بھولتی جا رہی ہو۔"
رینوکا کے چہرے پر راکیش کی اس بات کا کوئی اثر نہ تھا۔ وہ بولی۔ "مقصد کی اہمیت میں جیون کے انت کال تک نہ بھول سکوں گی۔ مگر مجھے احساس ہو رہا ہے میں اتنے کٹھن آدرش کو حاصل نہ کر سکونگی۔"
راکیش قدرے اُداس ہوتا ہوا بولا۔ "موت کو کھیل سمجھنے والی دیوی کیا ہمت ہار گئی ہے؟"
رینوکا راکیش کی بات کا جواب نہ دیتے ہوئے بولی۔ "آج پتا جی آئے تھے۔"
راکیش نے پوچھا۔ "تو"
رینوکا بولی۔ "کہہ رہے تھے مجھے دوسری شادی کرنی ہوگی۔"
راکیش نے پوچھا۔ "تم نے کیا جواب دیا"
رینوکا بولی۔ "میں چپ رہی"
راکیش نے پوچھا۔ "کیوں"
رینوکا نے کہا۔ "انہوں نے بات ہی اس ڈھنگ سے شروع کی تھی۔"
راکیش نے پوچھا۔ "کس ڈھنگ سے"
رینوکا نے کہا۔ "آپ کو سن کر دکھ ہوگا۔"

راکیش پھر قدرے اداس ہوتا ہوا بولا "تم کہو مجھے کوئی دکھ نہیں ہوگا۔"

ربنوکا نے کہا "انہوں نے کہا۔ لوگ کہتے ہیں۔ راکیش کا آشرم رنڈیوں کا اکھاڑا ہے اور ربنوکا اس اکھاڑے کی ایک اپسرا ہے۔"

راکیش سوچ میں پڑ گیا۔

ربنوکا نے کہا۔ "آپ کے دل کو بھی آخر چوٹ لگی نا؟"

راکیش کے لہجہ میں خوف کی ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ جب اس نے کہا "معلوم ہوتا ہے سماج نے ہم سے جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔"

ربنوکا نے کہا "ایک بات اور ہے۔"

راکیش اور بھی سنجیدہ ہوتا ہوا بولا "کیا؟"

ربنوکا نے کہا "سماج کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمارے پاس ہے کیا۔ اور پھر بہت سوچنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں۔ کہ یرقان کا علاج آپ آنکھوں کے پیلے پن کو پانی سے دھو کر کرنا چاہتے ہیں۔"

راکیش بے جان نگاہوں سے ربنوکا کی طرف دیکھنے لگا۔

ربنوکا بولی "آپ سمجھتے ہیں کہ بیماروں کو دوا دے کر۔ ودھواؤں کی شادی کرا کر یا لوگوں کو شراب نہ پینے کا اپدیش دے کر۔ آپ سماج کے کوڑھ کو دھو سکینگے؟"

راکیش نے پوچھا۔ "تو؟"

ربنوکا بولی "۔ آپ کے سماج کے کچھ لوگ جسے پاپ سمجھتے ہیں۔ دوسرے لوگ اُسے پُنیہ کہتے ہیں۔ سماج ظالم اور مظلوم دو گروہوں میں بٹ چکا ہے۔"

راکیش ربنوکا کی دلیلوں میں اُلجھ گیا۔

رینوکا بولی "مظلوموں کے سروں کے زخموں کو دھونے سے پہلے ظالموں کے ہاتھوں سے لاٹھیاں چھیننی ہونگی۔ اور آپ میں مجھے یہ جرأت دکھائی نہیں پڑتی"۔

راکیش نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں؟"

رینوکا نے کہا "آپ میرے ساتھ چھت پر آئیے۔ نیچے کی سیڑھیوں کا دروازہ آتے ہوئے کھول آئیے۔ کوئی نیچے سے سامان بھلے اٹھالے جائے۔ مگر آپ کو میرے ساتھ اکیلے بیٹھی دیکھ کر کوئی کسی قسم کا شک نہ کر سکے"۔

راکیش چپ رہا۔ رینوکا چاندنی میں دیکھ رہی تھی کہ راکیش کا چہرہ اتر گیا ہے۔ وہ بولی "آپ اور آپ کے آشرم کے رضاکار خود کو مظلوموں کے ہمدرد سمجھتے سمجھتے اپنے آپ کو ان سے بلند سمجھنے لگ پڑے ہیں۔ آپ کے اُپدیشوں میں درد کی ٹیسیں نہیں ہوتیں بلکہ احساس برتری کی چنگاریاں ہوتی ہیں"۔

راکیش جھنجلا اٹھا۔ "یہ غلط فہمی ہے"۔

رینوکا راکیش کی جھنجلاہٹ سے بے نیاز ہوتے ہوئے بولی "یہ غلط فہمی نہیں حقیقت ہے راکیش بابو! آپ لوگ قتل گاہ میں پہنچ کر دوسروں کو مظلوم سمجھ لیتے ہیں اور خود کو اپنے سروں پر منڈلانے والی موت نظر نہیں آتی"۔

راکیش کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ وہ بولا "آج پتاجی کی باتوں نے تمہاری طبیعت کو تلخ بنا دیا ہے"۔

رینوکا نے جواب دیا۔ "جی نہیں۔ یہ باتیں تو بہت دنوں سے میرے دماغ میں آ رہی تھیں"۔

راکیش نے رینوکا کے چہرے کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو تم میری

جڑانوں کا امتحان لینا چاہتی ہو؟"

رینوکا نے بڑی بے نیازی سے کہا۔ "جی نہیں۔ مگر مجھے آپ کو دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ میرے خوابوں کے راکیش جی سے بڑھ کر بہادر بن سکیں"۔

راکیش گہری سوچ میں پڑ گیا اور رینوکا چھت سے نیچے اتر آئی۔

وہ چھت پر ٹہلنے لگا۔ اس نے سوچا۔ شاید رینوکا کے پتا جی اسے گھر واپس لے جانا چاہتے ہیں اور اس لئے انہوں نے اس کے اور اس کے آشرم کے بارے میں اتنی بڑی بات کہہ دی ہے۔ دوسرے ہی لمحہ اس کا بے چین دماغ کراہ کراہ کر کہنے لگا۔ کوئی بھی باپ اپنی بیٹی کے لئے ایسی بات ہرگز نہیں کہے گا۔ رینوکا کی وجہ سے آشرم بدنام ہونا شروع ہو گیا ہے۔ ایک انسان محض انسان تمام ادارہ کی رسوائی کا باعث بن رہا ہے۔ رینوکا اگر آشرم سے چلی جائے۔ تو وہ کہیں گنگا کی لہروں ہی میں نہ کھو جائے اور پھر ایک مظلوم کی موت کا کلنک اس کے اور اس کے آشرم کے ماتھے سے کبھی نہ دھل سکے گا۔ مگر وہ اس کے پتا جی سے کہہ کر اس کی دوسری شادی کا بندوبست جلد سے جلد کرا سکتا ہے۔ اس کے پتا بھی تو یہی چاہتے ہیں کہ رینوکا اس راہبانہ زندگی کو ترک کر کے گرہست کا سکھ لے سکے۔ مگر رینوکا شاید دوسری شادی کرنے پر رضامند نہ ہو۔

ہوائیں خنک تھیں۔ مگر راکیش کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ اس کا دماغ اور بھی الجھتا جا رہا تھا۔ بالآخر اسے ایک حل سوجھ ہی پڑا۔ وہ چھت سے اتر کر اپنے پتا کے بت کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اسے محسوس ہوا کہ بت کے مرمریں سر میں لاکھوں دائرے گھوم رہے ہیں اور ہر دائرہ اپنے مرکز کو تبدیل کرتا جا رہا ہے۔ بت کی

نگاہوں میں اضطراب کے پیچ و خم لہرا رہے ہیں۔ اس کے چہرہ کے جذبات بے جان اور خشک ہیں

راکیش کا سر جھک گیا وہ بُت کے حضور میں کھڑا رہا۔ مگر بت کے دماغ میں اب دائرے اتنی تیزی سے گھومنے لگے کہ ان کی جھنجھناہٹ اس کے اپنے دماغ کی سوچ کو مفلوج کرنے لگی۔ وہ اس کمرے میں اور زیادہ نہ ٹھہر سکا۔ وہ تیزی سے رینو کا کے کمرے کی طرف آیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ مگر اس کے اپنے قدم ڈگمگا رہے تھے۔

اندھیرے کمرے میں سے رینو کا کی آواز آئی "کون ہے"؟

راکیش بڑبڑایا "میں ہوں راکیش"

رینو کا سرہانے رکھے ہوئے مٹی کے چراغ کو روشن کرتی ہوئی بولی۔ "آئیے میں بھی سو نہیں سکی ہوں"۔

راکیش کمرے میں آتا ہوا بولا۔ "میں ایک فیصلہ کرنے آیا ہوں"

رینو کا سوالیہ نگاہوں سے راکیش کی طرف دیکھنے لگی۔

راکیش نے کہا "تمہیں دوسری شادی کرنی ہوگی"۔

رینو کا بولی "آپ دلوں کا حال جاننے لگے ہیں۔ یہی فیصلہ میں نے کیا ہے"۔

راکیش کے چہرے پر مسرت کا نکھار آ گیا۔ وہ بولا "تو کل میں پتا جی سے ملونگا"۔

رینو کا نے کہا "ضرور ملیئے مگر ـــــ"

راکیش کا چہرہ پھر اُتر گیا۔ وہ بولا۔ "مگر کیا"؟

رینو کا بولی۔ "مگر میری یہ شادی گڈے گڑیا کا بیاہ نہیں ہوگا"۔

راکیش کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

رینوکا بولی۔ "میں جس کو چاہتی ہوں اس سے ہی شادی کروں گی۔"

راکیش نے پوچھا۔ "تم نے کسی کو پسند کیا ہے"

رینوکا "ہوں" کہہ کر خاموش ہو گئی۔

راکیش نے پوچھا "کون ہے وہ"

رینوکا نے راکیش کے قدموں پر ہاتھ رکھ دئے

راکیش گھبرائے ہوئے لہجہ میں بڑبڑایا۔ "رینوکا"

اس بار سر بہ خم رینوکا بولی۔ "سچ کہتی ہوں"

راکیش گڑگڑایا۔ "رینوکا! کاش تم یہ سچ کبھی بھی نہ بولتیں۔ تمہیں آشرم چھوڑنا ہوگا۔ میں یہ کلنک آشرم کے ماتھے پر نہیں لگا سکتا ہوں۔ تم اچھا ہی کرتی تھیں جو رات کو میرے کمرے میں نہیں آتی تھیں۔ ورنہ موہنت کے درشن کرنے کے بعد بھی جو کام کی چنگاری تمہارے من میں سلگتی ہی رہ گئی ہے ضرور کسی نہ کسی دن کسی کو بھسم کر دیتی۔"

رینوکا خاموش تھی

اب راکیش کی آواز میں گڑگڑاہٹ تھی وہ بولا۔ "کاش تم یہ چنگاری گنگا کی پوتر لہر دل ہی میں بجھا آتیں۔"

رینوکا خاموش رہی۔

راکیش اس کمرے میں بھی نہ ٹھہر سکا۔ وہ بھاگتا ہوا پھر اپنے پتا کے بت کے حضور میں آ کھڑا ہوا۔ بت کی پیشانی پر نور برس رہا تھا۔ چہرہ کے جذبات پر گنگا کی دوشیزگی مچل رہی تھی۔ اور فضا میں امرت کی مٹھاس رقصاں تھی۔ وہ سجدہ میں

گر گیا۔

آشرم سے رینوکا چلی گئی تھی۔ مگر آشرم کی روزمرہ زندگی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ آدھ درجن رضاکار حسب سابق اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ صبح صبح ویسے ہی سندھیا ہوتی۔ ورزش ہوتی۔ بڑے بڑے آدمیوں کے کارناموں پر بحث مباحثے ہوتے۔ مہارشیوں کی تصانیف پر تبصرے ہوتے۔ اپاہجوں کی خدمت۔ بیواؤں کی سیوا۔ مریضوں کی تیمارداری سب کام حسب معمول ہو رہے تھے۔ مگر راکیش آشرم کی روحانی فضا میں ایک خلا محسوس کر رہا تھا۔ وہ خلا جو دن بدن بڑھتا ہی جا رہا تھا اس نے اپنے والد کے بت کے حضور میں پہروں بیٹھ کر بارہا اپنی سندھیا سے فارغ ہو کر اور اکثر اس وقت جب صبح کا نور رات کی ظلمت کے سینہ کو چیر کر آسمان پر اپنا سفید پرچم بلند کرتا ہے اور دور گلابی چلمنوں کے پیچھے افق کی دیوی شبنم سے نکھر اور دھو کر انگڑائی لیتی ہے۔ اس خلا کی وجہ کو تلاش کیا تھا۔ لیکن وہ کسی بھی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا تھا۔ وہ اس خلش کو ختم کر دینے کے لئے اپنے شعور کو بہلا دیتا کہ یہ خلا اس کی اس شکست کی دین ہے۔ جو اسے رینوکا کے ذہنی مرض کے ہاتھوں نصیب ہوا۔ وہ آشرم میں بیمار آئی تھی۔ اس کا شعور مفلوج ہو چکا تھا۔ وہ بیمار ہی چلی گئی۔ آشرم کا ماحول۔ اس کے اپدیش سب ناکارہ ثابت ہوئے۔ مگر راکیش کا دل اس دلیل سے مطمئن ہونے کی بجائے اور بھی سرکش ہو جاتا۔ اس کے احساس کی نبضیں دھڑک اٹھتیں اور اس خلا کے دائرے وسیع ہونے لگتے۔ اس کا شعور بیتے ہوئے واقعات کو ایک ایک کر کے پرکھنے لگتا۔ گنگا کی مہیب لہروں سے بچا کر وہ

رینوکا کو اس کے پتا کے گھر لے گیا تھا۔ سب کہانی سن کر اس بوڑھے سادہ لوح سکول ماسٹر نے اس کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا تھا۔ اور پھر اس کی شخصیت اور اس کی شرافت سے مرعوب ہو کر رینوکا کے پتا نے رینوکا کو نہ صرف اس کے آشرم میں آنے جانے کی اجازت ہی دے دی تھی بلکہ وہاں رہ جانے پر بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

برسات کی وہ صبح حسین تھی۔ اس دو منزلہ آشرم کے چاروں طرف میلوں تک ہرے ہرے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ داہنی طرف کچھ دور پر وہ چھوٹا سا جوہڑ ایک اچھی خاصی جھیل بن گیا تھا۔ بھادوں کی بہاریں سبزے کی بالیوں سے اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ اس جوہڑ کے عقب سے جہاں آموں کے گھنے درختوں کی گود میں کوئی منچلا اپنی جھونپڑی کے دروازے سے لگا ملہار گا رہا تھا۔ قوسِ قزح، اونچے اونچے درختوں کو پھلانگ کر محیطِ آسمان سے بھی آگے اچھل جانا چاہتی تھی۔ اور جوہڑ کے نیلے پانی میں اس کے سہ رنگی عکس کو بھادوں کی ننھی ننھی بوندیں بار بار گدگدا دیتیں۔ اور وہ لہراتا ہوا اس نیلے پانی میں گم ہو جاتا۔ اور پھر ابھر آتا۔ راکیش آشرم کی دوسری منزل والی کھڑکی میں قدرت کے ان ہوش رُبا مناظر میں گم ہو چکا تھا۔ کہ ایک رضاکار نے اطلاع دی "رینوکا دیوی آئی ہیں آپ سے ملنا چاہتی ہیں"۔

راکیش کو جھٹکا سا لگا۔ اس برسات میں صبح صبح رینوکا آئی ہے۔ نیلے جوہڑ کے قریب کتنے ہی مینڈک ٹرانے لگے۔ اور کتنے ہی خدشات۔ کتنے ہی وسوسے اس کے دماغ میں بھنبھنا اٹھے۔

رضاکار نے پوچھا۔ "کیا کہہ دوں؟"

راکیش الجھی الجھی نگاہوں سے رضاکار کی طرف دیکھنے لگا۔ رضاکار بھی خاموش کھڑا رہا۔

پھر وہ بڑبڑایا۔ "بھیج دو انہیں یہاں۔"

کچھ ہی دیر بعد راکیش سر سے پاؤں تک بھیگی ہوئی رینوکا کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔

وہ بولی۔ "میں نے دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

راکیش بالکل خاموش رہا۔

رینوکا چٹائی پر انگلیاں چلاتی ہوئی پھر بولی۔ "پتا جی کو میرے مستقبل کی فکر نے نڈھال کر دیا ہے۔ اگر انہیں زندہ رکھنا ہے تو مجھے دوسری شادی کرنی ہی ہوگی۔"

راکیش خاموش ہی رہا۔

رینوکا اس بار راکیش کے چہرے کی طرف دیکھتی ہوئی پھر بولی۔ "آپ نے مجھے جیون دان دیا ہے۔ آپ کا آشیرباد لینا تو ضروری ہے۔ اس لئے آئی ہوں۔"

اس بار راکیش بولا۔ "میرا آشیرباد تمہارے ساتھ ہے۔"

رینوکا پرنام کر کے چل دی۔ ابھی وہ دروازہ تک ہی پہنچی تھی کہ راکیش کی گھمبیر آواز گونجی۔ "رینوکا"

رینوکا کے قدم رک گئے۔ وہ بغیر پیچھے گھومتے ہوئے بولی۔ "جی"

راکیش نے لہلہاتے کھیتوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری خواہش ہے

بھگوان تمہارے جیون کو سکھی بنائے!"

رینوکا "جی" کہہ کر چل دی۔

راکیش کی گھمبیر آواز پھر گونجی۔ "رینوکا"

رینوکا پھر رُک گئی۔

راکیش نے آموں کی ٹہنیوں پر ناچتی ہوئی قوس قزح کو دیکھتے ہوئے پوچھا

"شادی کے بعد آشرم میں آیا کرو گی نا؟"

رینوکا نے جواب دیا۔ "مجھے کیا معلوم۔ جس سے شادی ہو گی۔ یہ تو وہی بتا سکتا ہے"۔

راکیش نے پوچھا۔ "بر تم نے پسند کیا ہے؟"

رینوکا کا جواب تھا "نہیں"۔

راکیش اور کچھ نہ پوچھ سکا۔ اور رینوکا زینہ اُتر کر چلی گئی۔ ایک رضاکار نے اُسے چھاتہ اور کمبل پیش کیا۔ مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا۔

دن بھر پانی برستا رہا۔ اور راکیش کی اداسی بڑھتی گئی۔ اس دن وہ اپنی سندھیا میں بھی یکسوئی نہ حاصل کر سکا۔ ورزش تو اُس نے کی ہی نہیں۔ کھانا بھی وہ اچھی طرح نہ کھا سکا۔ دوپہر ہوتے ہوتے اس کے دماغ میں گویا اس نیلے جوہر کے تمام مینڈک ابھر آئے تھے۔ اور وہ اتنی شدت سے ٹرا رہے تھے۔ کہ راکیش اپنے کمرے کے تخلیہ میں بھی خود کو کسی ہوش شکن ہجوم کے قدموں تلے روندتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ بالآخر اس کے تحت الشعور سے ایک بڑبڑاہٹ ابھرنے لگی۔ رینوکا کو دوسرا شادی نہیں کرنی چاہیئے۔ اُسے معلوم نہیں اس کا بر کون ہے۔ اس شادی کے

بعد تو اسے کوئی بھی گنگا کے مہیب دھاروں سے نہ بچا سکے گا۔ اور پھر اس کا باپ بھی تو نہ زندہ رہ سکے گا۔ رینو کا کا شعور اتنا لطیف ہے۔ اتنا سلجھ چکا ہے۔ وہ اتنا صحت مند ہے کہ اُسے اس کے مذاق کا بَر آسانی سے مِل ہی نہ سکے گا۔ اور ایک قیمتی زندگی ختم ہو جائے گی۔ دفعتاً راکیش کے تحت الشعور کی اس بڑبڑاہٹ کا گلا کسی ایسے خیال نے گھونٹ دیا۔ جس کا ہلکا ہلکا سایہ وہ محسوس کر سکتا تھا۔ مگر جس کی آواز۔ جس کی شکل۔ جس کی ماہیت۔ اس کے احساس کی گرفت سے بالاتر تھے۔

دن کے سائے ڈھلتے جا رہے تھے۔ اور راکیش اپنے شعور کے تانوں بانوں میں الجھتا جا رہا تھا۔ وہ جب بھی اس فیصلہ پر پہنچنا چاہتا تھا کہ وہ رینو کا کی دوسری شادی ہرگز نہ ہونے دیگا۔ ایک تند و تیز حساس اس کے سِلسلۂ خیال کو منقطع کر دیتا۔ رینو کا کے پتا کے مرنے کے بعد اس کا کیا ہوگا۔ اُس کی لاابالی طبیعت اس کو ایک جگہ کبھی نہ ٹکنے دیگی۔ پھر وہی گنگا کی مہیب لہروں کے ہولناک جبڑے!

——— تو وہ خود اس کے ساتھ شادی کرلے ——— مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے وہ اس کی ذات کا نہیں۔ اس کے خاندان کا معیار کچھ بھی نہیں۔ اس کا خاوند اسے طلاق دے چکا ہے۔ سماج اسے اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا اور پھر زہر کے تلخ گھونٹ وہ خود تو پی سکتا ہے اپنی ماں کو کیسے پلا سکتا ہے۔ آج تک اُس نے اپنی ماں کی کوئی بھی خواہش پوری نہیں کی تھی۔ اس کی ماں چاہتی تھی کہ اتنی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اب وہ کوئی اچھی سی نوکری کرلے۔ یا پھر اس کے پتا اتنا کما کر چھوڑ گئے ہیں۔ وہ کوئی کاروبار کرلے۔ مگر اس کی والہانہ اُمنگوں نے جذبات کے سرکش دھاروں میں بہ کر اپنی ماں کی ہر خواہش کو ٹھکرا دیا تھا۔ وہ خاموش طبع ماں جس کی

نس نس میں ممتا کا امرت رچا ہوا ہے۔ اپنی امیدوں کو ایک ایک کرکے پامال ہوتے
دیکھتی چلی گئی۔ مگر اسے آج تک کچھ نہ کہا۔ وہ یہ آشرم کھول کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے
کی ساری پونجی اس آشرم کی نذر ہوتی جا رہی تھی۔ مگر اس کی ماں کی نگاہوں میں کبھی کبھی
کوئی ناراضی نہ جھلکی تھی۔ وہ رینو کا سے شادی کی تجویز کرکے ماں کے دل پر اب مر
چوٹ نہیں لگا سکتا ہے ممکن ہے اس کا کلیجہ پھٹ جائے۔ وہ زندہ نہ رہ سکے ا
پھر اس کے والد کی روح اسے کبھی نہیں بخشے گی۔ اس کے بت کے لبوں پر تبسم
کی مدھم سے مدھم کرن تک بھی کبھی نہ آئے گی اور اس کی زندگی ایک لعنت بن کر
جائے گی۔ موت بھی پھر اسے سکون نہ دے سکیگی۔

کتنے ہی دن بیت گئے۔ مگر راکیش کی اداسی نہ چھٹی۔ ایک روز دوپہر کو
کھانے کے بعد وہ حسب معمول موٹی سی اپنشد کی کتاب میں اپنی الجھنوں کو غرق
کی سعی لاحاصل کر رہا تھا۔ کہ ایک رضاکار آکر خاموش کھڑا ہو گیا۔

راکیش نے کتاب بند کرکے پوچھا۔ "کیا بات ہے ستیش"؟

ستیش نے اٹکتے اٹکتے کہا۔ "جی۔ راج اور فتح چند جا رہے ہیں"۔

راکیش نے پوچھا۔ "کہاں"؟

ستیش نے گردن جھکائے جواب دیا۔ "بس ہم جا رہے ہیں"۔

راکیش نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔ "آشرم چھوڑ رہے ہو
تم لوگ"؟

ستیش نے دبی زبان میں کہا۔ "جی"

راکیش نے پوچھا۔ "کیوں؟ مانو سیوا کی جو قسم کھائی تھی اسے توڑ دو۔

سنتیش نے روشندان پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ "آپ خود سب کچھ سمجھتے ہیں"۔

راکیش نے نہایت سادگی سے کہا۔ "مجھے تو کچھ بھی نہیں معلوم۔ تم لوگوں کو کوئی تکلیف ہے"؟

سنتیش بولا۔ "تکلیف ہمیں کیا ہوتی۔ آپ ہمارے جانے کی وجہ سمجھتے ہی ہیں۔ ورنہ آپ اتنے اداس کیوں ہوتے"۔

راکیش کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "مجھے سچ مچ کچھ نہیں معلوم"۔

سنتیش زمین کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "آپ جانتے ہی ہیں علاقہ میں آپ کی کتنی بدنامی ہو رہی ہے"۔

راکیش نے پوچھا۔ "میری بدنامی ہو رہی ہے"؟

سنتیش بولا۔ "جی ہاں! لوگ کہتے ہیں۔ سنتیش بابو نوٹ بناتے ہیں۔ ورنہ آشرم کا خرچ کہاں سے چلتا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے ہمارے آشرم میں بم بنائے جاتے ہیں۔ اور کچھ لوگ تو قسمیں کھا کھا کر کہہ رہے ہیں کہ ہم لوگ لڑکیاں بیچنے کا بیوپار کرتے ہیں۔ کل ایک پولیس والا بھی آشرم کے چاروں طرف منڈلا رہا تھا"۔

راکیش بہت گہری سوچ میں پڑتا ہوا بولا۔ "تم لوگ تو جانتے ہو۔ سچائی کے راستے میں کتنی آزمائشیں آتی ہیں"۔

سنتیش نے اپنی سمجھ سے بھی بلند بات کہی۔ "تلوار کو جھکا کر پرکھا جا سکتا ہے۔ اُسے توڑ کر کون آزمائش کرتا ہے"۔

راکیش کی زبان کو تالا لگ گیا۔

ستیش نے پوچھا۔ "تو ہم لوگوں کو اجازت ہے"؟

راکیش گویا نیند سے چونکا۔ "سب لوگوں کو بلاؤ"!

کچھ ہی دیر بعد آدھ درجن رضا کار راکیش کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

راکیش نے فیصلہ دیا۔ "آشرم بند کیا جاتا ہے۔ آپ لوگ جا سکتے ہیں۔ میں فی الحال یہاں اکیلا رہونگا"۔

رضا کار چلے گئے۔

اس رات اُس کے والد کے بُت کے چہرے پر کوئی بھی جذبہ نہیں تھا۔ اس کی آب دار سطح پر محض چراغ کی لَو کا گلابی پر تو مرمر کر جھلملا رہا تھا۔ بُت تراش کے ہلکے پھلکے اوزاروں نے جو نقوش جہاں تراش دئے تھے۔ وہ جُوں کے تُوں تھے۔ خنک سخت اور بے لوچ۔ اس نے بت کو چھوڑ کر اس میں زندگی کی حرارت کو محسوس کرنا چاہا۔ وہ سرد تھا بالکل سرد۔ مردہ جسم سے بھی زیادہ سرد اور بے حِس۔

راکیش کی ماں کے چہرے کی اُداسی دن بہ دن ڈھلتی جا رہی تھی۔ اس کی پژمردہ اُمیدیں پھر ہری ہو چلی تھیں۔ راکیش آشرم بند کر کے پھر گھر ہی میں رہنے لگ پڑا تھا بلکہ اس نے شہر کی ایک مشہور فرم میں ہیڈ کلرکی بھی کر لی تھی۔ ماما کو لاڈ کا گھر بستا نظر آ رہا تھا۔

مگر راکیش اپنی موجودہ زندگی سے بھی مطمئن نہیں تھا۔ وہ شام کو چھ بجے دفتر سے جس وقت چھاتا اٹھا کر چلتا تھکے تھکے خیالات اس کے مضمحل شعور سے

بھر کر بڑبڑانے لگتے"۔ کیا اسی کا نام زندگی ہے؟ صبح اٹھنا۔ نہادھو کر کھانا کھاکر دفتر آجانا۔ اور پھر موٹی موٹی بادامی رنگ کی فائلوں میں دن بھر غرق رہنا۔ شام کو تھکے ہوئے جسم میں خستہ دماغ کو گھر لے جاکر بستر پر پٹک دینا۔ یہی زندگی اس کے دفتر کے ساتھیوں کی بھی تھی۔ مگر اُس نے انہیں کبھی اداس نہ دیکھا تھا۔ کام وہ اس سے کم نہ کرتے تھے۔ مگر ان کے چہروں سے کبھی وحشت کے نقوش ہویدا نہیں ہوتے تھے۔ ان کے لطیفے اور ان کی گپیں ان موٹی موٹی بادامی رنگ کے کاغذوں کی فائلوں سے اچھل کر دفتر کی خشک فضا کو قابلِ برداشت بناتی رہتیں۔ اس کے ذہن نے اعتراف کیا کہ اس کے ساتھیوں کو زندہ رہنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ وہ سلگتی ہوئی بھٹی کے سامنے بیٹھ کر پگھل نہیں جاتے۔ بلکہ تیز اور تند شعلوں کے ساتھ بھی سکرانا جانتے ہیں۔ انہوں نے کبھی ان لمبے چوڑے سنہری سپنوں کے تانے بانے ہی نہیں بُنے جن میں رُوح پھنس کر اپنی لطافت گنوا بیٹھتی ہے۔

راکیش اپنے دفتری ماحول میں سما جانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس میں اُسے کامیابی بھی ملنے لگی تھی۔ اس کے ساتھیوں کے قہقہے۔ ان کے رنگین لطیفے۔ ان کے چٹخارے دار بیانات۔ اس کی مضمحل رُوح کو بھی تھپکیاں دینے لگے۔

سنیچر کی شاموں کو اب وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ چوک اور مال روڈ کی سیر کرتا کرتا سینما گھروں میں نکل جاتا۔

روایات۔ توہمات۔ عقاید اور پارینہ اصولوں کی چٹانوں پر بندھے ہوئے بندھن پہلے باریک باریک دراڑیں پڑیں۔ اور پھر بے باک آزادی کے تیز

دھارے پھوٹ نکلے۔ ہر اتوار کو ورما بابو کے ہاں رمّی کا پروگرام ہوتا۔ ہفتہ میں چار دن تو سینما کہیں جاتا ہی نہیں۔ اس کے لباس۔ اس کی بول چال اور اس کی طرز رہائش میں زمین و آسمان کا فرق پڑ گیا تھا۔ اس کے والد کا بُت تو ایک مدت سے سُرخ دبیز لبادہ اور اس لبادہ پر جمی ہوئی گرد کی موٹی تہ کے تلے سو رہا تھا۔

ورما ناک میں بولتا تھا۔ مگر اپنی بات میں اثر رکھتا تھا۔ میاں چرکیں سے لے کر استاد نظیر تک کے سینکڑوں شعر اسے زبانی یاد تھے۔ غالب اقبال جوش اور جگر کا وہ قائل ہی نہ تھا۔ اس کا نظریہ تھا۔ کہ شعر اگر دماغ سے اتر کر دل کو مسلتا ہوا آنتوں کو نہیں گدگدا دیتا تو شعر ہی نہیں۔ اس کا وجود دفتر کی دنیا میں مسلسل قہقہوں کو جنم دیتا رہتا۔ اس کے پان آلودہ لبوں پر ناچتا ہوا تبسّم ہر وقت کسی نہ کسی لطیفہ کے اجاگر ہونے کا امکان پیدا کرتا رہتا۔ ورما کی سیر و تفریح کے فیصلوں کے آگے سر خم کرنا اس کے ساتھی اپنا فرض اولین سمجھتے تھے۔

اس اتوار کی شام کو جب آسمان پر اُودی اُودی گھٹائیں تیر رہی تھیں اور فضا میں جذبات کو چھیڑ دینے والی خنکی رقص کر رہی تھی۔ ورما نے رمّی کی آخری بازی ختم کرتے ہوئے فیصلہ دیا تھا کہ گانا سنا جائے گا۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ رات ہوتے ہوتے راکیش بھی ورما۔ برجموہن اور جگ جیت وغیرہ کے ساتھ حمیدہ کے کوٹھے پر جا پہنچا تھا۔ گانا سننے کے بعد جس وقت راکیش گھر لوٹا رات کے دو بج چکے تھے۔

وہ دبے پاؤں دروازہ کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور نوکر کو آہستہ آہستہ آوازیں دینے لگا۔ دروازہ کھل گیا۔ مگر آج اس نے نوکر سے اپنی ماں کے بارے

میں کچھ بھی دریافت نہ کیا۔ وہ کھانا کھا کر اپنے بستر پر دراز ہو گیا اور بجلی بجھا کر بہت دیر تک اپنے داہنے رخسار کو ملتا رہا۔ ورما نے جیب سے چاندی کا روپیہ نکال کر اس کے رخسار سے چسپاں کر دیا تھا اور حمیدہ نے ورما کی گرفت سے وہ روپیہ چھینتے وقت اس کے رخسار پر چٹکی بھر لی تھی۔

ٹوٹے ہوئے بن کے شگاف وسیع تر ہو رہے تھے۔ اور بے باک دھالے تیز تر ہوتے جا رہے تھے۔ ماں کے ہاتھوں میں تنخواہ دیتے ہوئے اسے کتنے ہی مہینے گذر گئے تھے۔ گھر کے خرچ کے لئے کبھی کبھی وہ دس پانچ روپے دے دیتا نوکر کی تنخواہ بھی تین چار مہینے سے نہیں دی گئی تھی۔ ماں نوکر کی بدتمیزیاں برداشت کرتی مگر راکیش کو کچھ نہ کہتی۔ اور وہ اسے کہتی بھی کیا۔ اسے یقین تھا۔ کہ راکیش نے اس سے کبھی جھوٹ نہیں بولا ہے۔ اور اس کی تنخواہ دو سو روپیہ ماہوار سے گھٹ کر ستّر روپیہ ماہوار رہ گئی ہے۔ بڑے صاحب ناراض ہو گئے تھے نا۔

اس دوپہر کو نیند سے فارغ ہونے کے بعد راکیش ورما صاحب کے ہاں جانے کے لئے قریب قریب تیار ہو چکا تھا۔ وہ آئینہ میں اپنی ٹائی کا جائزہ لے رہا تھا کہ نوکر نے اطلاع دی "کوئی دیوی جی ملنے آئی ہیں۔"

استفسار راکیش کی پیشانی پر سلوٹیں بن کر نمودار ہو گیا۔ وہ بولا "مجھ سے؟"

نوکر نے کہا۔ "جی"

راکیش نے کہا۔ "لے آؤ انہیں یہاں۔"

رینوکا کو اپنے کمرہ میں دیکھ کر راکیش کچھ دیر کے لئے حیرت میں آ گیا اور رینوکا

راکیش کو اس بھڑکیلے سوٹ میں دیکھ کر ششدر رہ گئی۔

راکیش بولا "تشریف رکھیے"۔

رینوکا ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

راکیش نوکر کو چائے لانے کا حکم دے کر خود ایک دوسری کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔

"کہیے آپ اچھی طرح سے ہیں؟"

رینوکا نے گھمبیر آواز سے کہا۔ "جی"

راکیش نے پوچھا۔ "شادی تو ہو گئی آپ کی؟"

رینوکا کچھ نہ بولی ۔ بلکہ صرف سر ہلا کر انکار کیا۔

راکیش نے پوچھا "کیوں؟"

رینوکا چپ رہی ۔ راکیش سیٹی بجانے لگ پڑا۔

رینوکا نے پوچھا۔ "آپ تو بالکل بدل گئے ہیں"۔

راکیش نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "ہر چیز بدل جاتی ہے۔ بھگوان خود بدل گیا ہے۔ سماج بدل گیا ہے۔ موسم بدل گئے ہیں۔ ستاروں کی گردش بدل گئی ہے میں تو محض انسان ہوں"۔

رینوکا کسی سوچ کی گہری تہ میں ڈوبتی ہوئی بولی۔ "کچھ چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں راکیش بابو جو کبھی نہیں بدلتیں"۔

راکیش قدرے سنجیدہ ہوتا ہوا بولا۔ "ہوگا"۔

اور پھر رینوکا اپنے تفکرات سے یک لخت ابھرتی ہوئی بولی۔ "بہاروں کے نصیب الٹ جاتے ہیں۔ خزاں کی تلخی کبھی نہیں بدلتی"۔

راکیش نے بہت گمبھیر ہوتے ہوئے پوچھا "آپ شاید بہت پریشانیوں میں گھر گئی ہیں۔"

رینوکا نے جواب دیا "اب پریشانیاں مجھ پر کچھ اثر نہیں کرتیں۔ زندگی جیسی تھی ویسے ہی چل رہی ہے۔"

نوکر چائے لے آیا۔ دونوں خاموشی سے چائے پیتے رہے۔

رینوکا نے پوچھا "ماں جی کہاں ہیں؟"

راکیش نے کہا "اوپر کے کمرے میں ہیں۔"

رینوکا نے پوچھا "انہیں آپ کا یہ رہنا سہنا پسند ہے؟"

راکیش کی نگاہوں میں مسرت اور اطمینان کی لہریں کوند اٹھیں جب اس نے کہا "انہیں وہ سب کچھ پسند ہے جو ان کے راکیش کو پسند ہے۔"

رینوکا اٹھتے ہوئے بولی "میں ماتا جی کے چرنوں پر سر رکھنا چاہتی ہوں۔"

راکیش نے بھی اٹھتے ہوئے پوچھا "آپ آیا کریں گی نا؟"

رینوکا نے راکیش کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی نگاہوں میں زہر کی خشکی نہیں، اصرار کی لطافت ہے۔ رینوکا نے سر جھکا لیا۔

راکیش بولا "آجایا کیجئے۔ اتوار کو دوپہر تک میں گھر پر ہی ہوتا ہوں۔"

رینوکا چلتے ہوئے بولی "اچھا دیکھئے۔"

اس دن راکیش جلد ہی دفتر سے گھر آگیا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اور سانس پھولی ہوئی۔ نوکر نے ماں کو اطلاع دی۔

ماں اس کے کمرے میں آتی ہوئی بولی "طبیعت ٹھیک ہے"؟
راکیش کے لہجہ میں تلخی تھی "ہاں ٹھیک ہے"۔
ماں کے لہجہ میں مٹھاس تھی۔ "دفتر میں آج چھٹی ہو گئی ہے"؟
راکیش گویا پھوٹ سا پڑا۔ "نہیں ماں! میں دفتر سے نکال دیا گیا ہوں۔
ورما۔ برجموہن۔ جگ جیت کوئی بھی مجھے نہ بچا سکے"۔
ماں نے بڑے پیار سے پوچھا "تم دفتر سے نکال دیے گئے ہو"؟
راکیش پھر ابلا۔ "کہہ تو دیا نکال دیا گیا ہوں دفتر سے۔ میں شراب پی
کر دفتر گیا تھا۔ بڑے صاحب برداشت نہ کر سکے"۔
ماں کا لہجہ ڈوب رہا تھا۔ مگر اس کی مٹھاس جوں کی توں تھی "تم شراب پیتے
ہو"؟
راکیش گرجا۔ "تم اندھی ہو ماں؟ تم نہیں دیکھتیں کہ میں چھ مہینے سے
شراب پی رہا ہوں۔ پہلے میں شام کو پیتا تھا۔ اور باہر پیتا تھا۔ پھر میں گھر میں
پینے لگا۔ پھر دن کو بھی پینے لگا۔ نوکر کو میں پیسے دے دیتا تھا۔ اس لئے
اس نے شاید تم سے نہیں بتایا۔ مگر تم اور تمہارا اتنا بوڑھا تجربہ کچھ بھی نہ
سمجھ سکا"۔
ماں کی نگاہوں سے دو ستارے ٹوٹ کر زمین پر آ گرے۔ وہ روندھے
ہوئے گلے سے بولی۔ "بیٹا! ہمارے ہاں کب کسی نے شراب پی ہے"؟
راکیش چپ رہا۔
ماں کرسی پر بیٹھنے کے لئے آگے بڑھنے لگی۔ راہ میں رکھی ہوئی میز سے

ٹکرا کر وہ فرش پر گر گئی۔ راکیش نے جھپٹ کر اُسے سہارا دیا۔

ماں اپنے گھٹنے کو سہلاتی ہوئی بولی۔ "میں سمجھی کہ کرسی ہے"۔

متعجب راکیش نے پوچھا "میز کو تم کرسی سمجھیں ماں"؟

ماں کی آنکھوں سے ستارے ٹوٹ پڑے۔

راکیش گھبرا گیا۔ وہ بولا۔ "کیا بات ہے ماں"؟

ماں بغیر کچھ کہے سُنے کمرے سے باہر جانے لگی۔ تو دیوار سے ٹکرا گئی۔ راکیش نے دوڑ کر اُسے پھر سنبھالا۔ اور چارپائی پر بٹھاتا ہوا بولا۔ "ماں بتاؤ کیا بات ہے"؟

ماں خاموش رہی۔

راکیش نے آخری حربہ استعمال کیا۔ "ماں بتاؤ نہیں تو میں جان دے دُونگا۔"

ماں کی سسکیاں بندھ گئیں جب اس نے کہا۔ "آٹھ مہینے سے میری آنکھوں میں موتیا اُتر رہا تھا۔ پرسوں سے دکھائی دینا بالکل بند ہو گیا ہے"۔

راکیش کچھ دیر تک اپنی ماں کی ویران آنکھوں کی طرف دیکھتا رہا اور پھر کرسی سے اُٹھ کر اس کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ماں کے صبر کا بند بھی ٹوٹ گیا۔ اس کے آنسو ٹپ ٹپ کر راکیش کے رخساروں پر گرنے لگے۔

ہچکیوں کے جال سے بمشکل تمام راکیش کے الفاظ آزاد ہوئے۔ "ماں تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا۔ میں اچھے سے اچھے ڈاکٹر کے پاس تمہیں لے جاتا"۔

ماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے پتا جی کی کمائی تو

بیٹا آشرم میں لگ گئی۔ ستر روپے مہینے سے تو گھر کے کھانے کا خرچ نہیں چلتا۔ ڈاکٹر کی فیس کہاں سے آتی۔"

یہ جواب سن کر راکیش کا دماغ چکرا گیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ دن بدن اس کی ماں کی بینائی گھٹتی جارہی ہے۔ اس کی آنکھیں کنوئیں میں دھنسی جارہی ہیں۔ اُن آنکھوں کا نور ہوا میں پرواز کرتا ہُوا حمیدہ کی آنکھوں میں سماتا جارہا ہے۔

اور وہ اپنی ماں کی آنکھوں پر پیار سے ہاتھ پھیرتا ہُوا چِلانے لگا۔ "ماں! مجھے نوکری کا کوئی غم نہیں ہے۔ نوکری جانی ہی چاہیئے تھی۔ تم نہ اُداس ہونا ماں! میں اور نوکری تلاش کرلونگا۔ ماں! میں اب کبھی شراب نہیں پیونگا۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ میں پہلے والا راکیش بن جاؤنگا۔ ماں! میں اس نوکر کو نکال دونگا۔ اُس نے بھی تمہارے بارے میں مجھے کوئی اطلاع نہ دی۔ ماں! میرا یقین کرو ۔ ———"

اس رات وہ اپنے پتا کے بُت کے سامنے جانا چاہتا تھا۔ وہ اس کے حضور میں سر بسجود ہو کر اپنے گناہوں کو بخشوانا چاہتا تھا۔ مگر اس کے شکست خوردہ شعور نے اس کے قدم سختی سے جکڑ دئے۔ وہ تین دفعہ اس کمرے تک آیا جس میں وُہ بت گرد آلودہ سُرخ لبادے کے تلے مدّتِ دراز سے غنودگی کے عالم میں پڑا تھا۔ لیکن اُس کمرے میں داخل ہونے کی جرأت نہ کرسکا۔

راکیش دفتر سے نکال دیا گیا۔ مگر درما کے دِل سے اُسے کون نکال سکتا تھا۔ بڑی جدوجہد اور کاوشوں کے بعد اُس نے راکیش جیسے سنیاسی اور

اور تارک الدنیا کو اپنا ہونہار شاگرد بنا کر اس کا تعارف زندگی کی رنگینیوں سے کرایا تھا۔ اور جب پنچھی اڑنا سیکھ چکا تھا تو بڑے صاحب کی عقل کو بقول برجموہن نہ جانے کونسی دیمک چاٹ گئی تھی۔ کہ ان کی مجلس کے اس نوجوان اور ذہین رُکن کو نکال باہر پھینکا تھا۔

ایک مہینہ سے بھی زیادہ عرصہ گذر گیا تھا۔ راکیش نے شراب کی بوتل تک کو نہ دیکھا تھا۔ اس نے اپنے اس خادم کو بھی کبھی کا برخاست کر دیا تھا۔ جس کو اعتماد میں سے کر وہ اپنے وقت کو مئے ناب سے رنگین بنایا کرتا تھا۔

اس رات جب فضائیں نشہ بیز تھیں۔ ماحول میں مدہوشیاں رقص کر رہی تھیں۔ چاند فرشِ نیلم پر جھینے جھینے سفید ابر پاروں کی چلمن کے پیچھے ستاروں کی محفل میں کیف کے جام لنڈھا رہا تھا۔ گلابی سائے اس نہر کی بلوریں سطح پر پھسلے پھسلے جا رہے تھے۔ کرنیں سطح آب پر روپہلی مچھلیاں بن کر تیر رہی تھیں۔ نازک لہریں دبے بھینچے قہقہے بکھیرتی دور بہت دور سبزے کی آغوش سے چمٹ جانے کے ارمان لئے دیوانہ وار لڑکھڑاتی ہوئی دوڑی چلی جا رہی تھیں۔

ورما اور اس کے رنگین مزاج دوستوں کے پیہم اصرار راکیش کو اس کنجِ عزلت میں لے آئے تھے۔ ورما ساحل کے خنک سبزے پر لیٹ گیا۔ اس کی نگاہیں بادلوں کے پیچھے لڑکھڑاتے ہوئے چاند پر جم گئیں۔ اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا "راکیش میں نے تیری نوکری کا بندوبست کانتی چرن کی فرم میں کر لیا ہے۔ مگر اب دن کو پی کر نہ چلے جانا کبھی"

راکیش پھیکی سی ہنسی ہنستا ہوا بولا "میں تے ایک سرے سے ہی پینی

چھوڑ دی ہے۔"

ورما اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ قہقہہ لگا کر بولا۔ "چغد ہے تو ۔۔۔۔۔ ایک سرے سے۔ بھی بھلا یہ کبھی چھوڑی جاتی ہے۔ شراب کو تو نے آخر سمجھ کیا لیا ہے۔ یہ کوئی گھر کی لونڈی تو نہیں، جسے جب چاہا آواز دے لی۔ یہ رات کی دیوی ہے جسے سورج کی پہلی کرن ہی اداس کر دیتی ہے۔ اس کی پوجا تاروں کی چھاؤں میں ہوتی ہے۔ ورنہ یہ بددعا دے دیتی ہے چغد!" اور اتنا کہہ کر وہ پھر قہقہے لگانے لگا۔ اس کے پان آلودہ دانت پھیکی پھیکی چاندنی میں فولاد کے ٹکڑوں کی طرح چمک اٹھے۔

راکیش خاموش رہا۔

برجموہن نے جیب سے بوتل، اور تھیلے سے جام نکال کر سبزے پر جما دئے۔ ورما نے اپنی بے سُری بھرائی ہوئی آواز میں چیخنا شروع کیا۔ ع

"زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر ۔۔۔۔۔ ہاں ۔۔۔۔۔ مسجد میں بیٹھ کر"

ساغر کھنکنے لگے۔ مینائیں قہقہے انڈیلنے لگیں۔ دوستوں کی توبہ شکن منتیں اور پُر خلوص اصرار کامیاب ہوتے۔ راکیش نہ پینے کی قسم مئے ناب کی تلخیوں میں سمو کر پی گیا۔

بند کے شگاف ایک ایک کر کے پھر کھلنے لگے۔ مگر اس بار راکیش کے دل و دماغ پر کسی پُر اسرار خاموشی کا تسلط ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی شخصیت کے گرد کسی معنی خیز سکوت کا ایسا ہالہ پڑ گیا تھا جسے اس کی ماں اور اس کے اکثر ساتھی سمجھنے سے قاصر تھے۔ ورما سے نوکری نہ دلوا سکا تھا۔ گو وہ اس کی طبیعت کی دبی ہوئی

آوارگی کو ابھارنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پھر بھی اُسے ورما سے کوئی کمپاؤنڈ نہیں پیدا ہُوا۔

وہ بہت دیر سے گھر آتا اور جو کھانا اس کا نوکر اس کے آگے رکھ دیتا کھا کر اپنے پلنگ پر دراز ہو جاتا۔ جب بھی کبھی اس کی ماں سے اس کا سامنا ہوتا وہ کچھ نہ کہہ پاتا۔ سر جھکا کر کھڑا رہتا۔ کبھی کبھی وہ دبی زبان سے اپنی وفاداری اور سعادت مندی کا احساس کرانے کی کوشش کرتا۔ لیکن جب کبھی اس کی ماں اسے دُعائیں اور تشفی دے کر اس کی شادی کا ذکر چھیڑتی۔ وہ اس موضوع کو یُوں ٹالتا۔ کہ بوڑھی ماں ہزاروں تفکرات کو اپنی بے نور آنکھوں میں سمیٹ کر اپنے کمرے میں آہیں بھرتی چلی جاتی۔

راکیش کی ہر حرکت شاہد تھی کہ اُس نے زندگی کی ذمہ داریوں سے نظر بچا کر راہِ فرار اختیار کر لی ہے۔ مگر ایک ذمہ داری کے احساس سے اس کا شعور آج تک نہ آزاد ہو سکا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ابھی اس کی ماں کی آنکھوں کا موتیا اچھی طرح نہیں پکا ہے۔ چار مہینے کے بعد اس کی آنکھوں کا اپریشن ہوگا اور پھر اُن بے نور آنکھوں کو تھوڑی بہت روشنی نصیب ہو سکے گی۔ راکیش گو اپنے مستقبل سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ مگر وہ یہ ضرور چاہتا تھا کہ ایک بار پھر اس کی ماں کی آنکھوں میں روشنی آجائے۔ کِسی طرح آجائے۔

اس اتوار کو جب دوپہر کے سائے ڈھل رہے تھے اور راکیش تھوڑی سی پی کر اپنے بستر پر خاموش لیٹا چھت کے شہتیروں کو گن رہا تھا۔ رینو کا آ پہنچی۔ راکیش اسے کُرسی پر بٹھانے کے بعد خود کرسی پر بیٹھ گیا۔ رینو کا راکیش کے چہرے

کی طرف دیکھ کر متحیر رہ گئی۔ وہ بولی۔ "آپ کو کیا ہو گیا ہے"؟
راکیش کے ہونٹوں پر قبرستان کی وحشت کا پھیکا پن چھا کر رہ گیا۔
رینوکا فکرمند لہجہ میں بولی۔ "آپ کا چہرہ آدھا رہ گیا ہے"!
راکیش کے ہونٹوں پر وہی پھیکا پن تھا۔ رینوکا چپ ہو گئی۔ مگر اس کی پلکیں نم آلودہ ہو گئیں۔
راکیش رینوکا کی بھیگی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "کچھ نہیں سب ٹھیک ہے"!
رینوکا کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ وہ بولی۔ "کیا ٹھیک ہے"؟
راکیش انگلیاں چٹخاتا ہوا بولا۔ "ٹھیک ہے جیسے زندگی گذر رہی ہے"!
رینوکا نے پوچھا۔ "ماتا جی کہاں ہیں"؟
راکیش نے جواب دیا۔ "اُوپر اپنے کمرے میں ہیں"۔
رینوکا بِنا کچھ کہے سُنے بالائی منزل کی طرف چل دی۔ راکیش اپنی چارپائی پر کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر وہ انگڑائی لیتا ہوا اُٹھا۔ اور الماری میں سے بوتل نکال کر اُس نے ایک پیگ اور چڑھا لیا۔ اور جیسے ہی وہ اپنے پلنگ پر پھر دراز ہو رہا تھا۔ رینوکا آندھی کی طرح کمرے میں داخل ہوئی۔ راکیش اس کی شکل دیکھ کر کچھ سہم گیا۔
رینوکا کے لہجے میں ترشی تھی۔ جب اُس نے کہا۔ "میرے سوالوں کا جواب دیجئے"۔
راکیش سوالیہ نگاہوں سے رینوکا کی طرف دیکھنے لگا۔
رینوکا بولی۔ "ماتا جی اندھی ہو گئی ہیں۔ جس گھر میں بہاریں جھومتی تھیں۔ آج

وہاں خزاں کے بھوت ناچ رہے ہیں اور آپ کو کوئی ہوش نہیں۔"

راکیش کی زبان لڑکھڑائی "میں کیا کر سکتا ہوں؟"

رینوکا کے لہجہ میں ترشی کے ساتھ ساتھ منت سماجت بھی تھی۔ "آپ کیا نہیں کر سکتے ہیں۔ پتاجی کا نام تو آپ نے شراب میں بہا دیا۔ اب ماتا جی کو تو کچھ دن زندہ رہنے دیجئے۔"

راکیش بُت بنا بیٹھا رہا۔

رینوکا بولی "آپ نے کبھی سوچا ہے کہ دوسروں کو نصیحتیں کرتے کرتے آج آپ خود کسی گہری خندق میں گر چکے ہیں۔ کتنی بدنامی ہو رہی ہے آپ کی۔"

اس بار راکیش بولا "مجھے اب بدنامی کی کوئی پروا نہیں۔ میرا دل پتھر ہو چکا ہے پتھر۔"

رینوکا کے لہجہ کی ترشی بڑھی۔ "تو ایک بار ہی اس پتھر کو ماتا جی کے سر پہ پٹک دیجئے۔ یوں آہستہ آہستہ ان کی جان کیوں لے رہے ہیں آپ۔"

راکیش آنکھیں بھینچتا ہوا بولا "کوئی کسی کی جان نہیں لیتا۔ سب اپنے اپنے نصیب کی باتیں ہیں۔"

رینوکا چپ ہو گئی اور پھر سوچتے سوچتے بولی۔ "میں اگر ماتا جی کی سیوا کے لئے یہاں آ جاؤں تو آپ کو تو کوئی اعتراض نہ ہوگا؟"

راکیش سوچ میں پڑ گیا۔

رینوکا نے اصرار کیا۔ "بتائیے نا۔"

راکیش بولا۔ "ماتا جی سے پوچھ لیجیے۔ اور ہاں آپ کے پتاجی کی دیکھ بھال کون

کرے گا؟"

رینوکا کا چہرہ بالکل پھیکا پڑ گیا۔ وہ امڈتے ہوئے جذبات کا زہریلا گھونٹ پیتے ہوئی بولی۔

"پتاجی کی دیکھ بھال بھگوان کر رہے ہیں۔ اور لڑکیاں یوں بھی تو میکے میں نہیں ——" کہتی کہتی وہ رک گئی۔ راکیش رینوکا کی بات کی تہ تک نہ پہنچ سکا۔ وہ بولا۔ "پھر بھی؟"

رینوکا کی آنکھوں سے آنسو اور اس کی زبان سے بے چارگی پھوٹ پڑی۔ وہ سسکیاں بھرتی ہوئی بولی "پتاجی پرسوں آٹھ دن بیمار رہ کر سورگ باش ہو گئے ہیں۔"

راکیش کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ رینوکا کی طرف پیار اور محبت کی نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔ "آپ نے پہلے نہیں بتایا؟"

رینوکا بھرائے ہوئے لہجہ سے بولی۔ "کیا بتاتی آپ کو میں؟" اور پھر وہ سسکتے ہوئے بولی۔ "بھگوان جانے میں کامیاب بھی ہو سکوں گی۔ میں تو یہی چاہتی ہوں کہ زہر خود پیتی رہوں اور آپ کو اگر دے سکوں تو امرت ہی دے سکوں"۔ رینوکا یہ کہہ کر کچھ دیر کے لیئے خاموش ہو گئی۔ اور وہ پھر بڑبڑائی۔ "آپ مجھے اب آپ کیوں کہنے لگے ہیں۔ مجھے تم کہہ کر ہی بلایئے۔ آپ بدل گئے ہیں لیکن میں وہی رینو ہوں۔"

اس بات کا موقعہ تھا نہ محل۔ مگر راکیش نہ جانے کیسے کہہ گیا۔ "تم جانتی ہو میں شرابی ہو گیا ہوں۔ بڑا بھینکر شرابی۔"

رینوکا کے چہرے کی بلائیں معصومیت نیاگ اور بھولا پن مے رہیے تھے جب وہ بولی ”تو کیا ہوا؟“

راکیش چپ رہا۔

رینوکا فیصلہ دیتے ہوئے بولی ”میں ماتاجی کو منالونگی۔ آپ انہیں نہیں سمجھ سکے ہیں۔ وہ کسی کا بھی دل توڑنا نہیں چاہتیں۔ وہ زہر پی کر بھی مسکراتی رہتی ہیں۔ میں انہیں ضرور منالوں گی۔ اور کل آپ کے یہاں آجاؤں گی۔ بلا تنخواہ کی نوکرانی رکھنے میں تو آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا؟“

راکیش خاموش ہی رہا۔ اور رینوکا بالائی منزل کی طرف چلی گئی۔

رینوکا کی آمد کے بعد راکیش کے پیشے میں تو کوئی کمی نہیں آئی تھی لیکن اس کے مزاج میں کافی انقلاب آگیا تھا۔ اس کی اداسی روز بروز ڈھلتی جا رہی تھی۔ چہرہ پر بھی شگفتگی آرہی تھی۔ لب ولہجہ میں بھی چٹخارہ پیدا ہوگیا تھا۔ اس کے کمرے میں اب اکثر اس کی سیٹی مدھم مدھم سُر میں گونجتی رہتی۔

ویسے بھی رینوکا کی آواز میں لوچ تھا۔ اور اس لوچ میں سوز تھا۔ جب کبھی وہ تان پورا لے کر صبح کے وقت بھیردی چھیڑتی تو راکیش بھی اس کے کمرے میں آجاتا۔ نغمے فضا کو گدگداتے ہوئے ابھرتے۔ ماحول میں راگنی کی مٹھاس تحلیل ہونے لگتی۔ تان پورے کی جھنکار کے پروں پر سُر آہستہ آہستہ پرواز کرنے لگتے۔ اور راکیش کی نگاہوں میں تحسین کے گلابی ڈورے اجاگر ہوجاتے۔ اس کا سانس نغموں کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ تیز اور آہستہ ہوتے ہوتے چند لمحات

کے لئے بالکل ہی مدھم پڑ جاتا۔ جب رینو کا راگنی کو سمیٹ کر مسکراتی۔ وہ مسرور سا ہو کر اپنے کمرے میں آ جاتا اور مدھم پڑتے ہوئے سرور کو شراب کے چھینٹوں سے اجاگر کرنے میں محو ہو جاتا۔

اس رات راکیش بہت جلد گھر لوٹ آیا۔ اس کی سیٹی کا انداز بتا رہا تھا۔ کہ وہ آج بہت خوش ہے وہ صحن میں داخل ہوتا ہی اپنے کمرے میں جانے کی بجائے بالائی منزل کی طرف چل پڑا وہ زینہ کو چند چھلانگوں ہی میں طے کرتا اپنی ماں کے کمرے میں آ گیا۔ رینو کا اس کی ماں کو اس وقت رامائن سنا رہی تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوتا ہوا بولا "رینو کا رامائن بند کرو۔ آج میں نے اپنی ماں سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں"۔

رینو کا راکیش کے متبسّم چہرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ اُسنے رامائن کو کپڑے میں باندھتے ہوئے پوچھا "میں چلی جاؤں"؟

راکیش بولا "نہیں تم بیٹھی رہو"۔

اور اس کے بعد وہ اپنی ماں کے قریب ہی چٹائی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک وہ چُپ رہا۔ پھر اس نے اپنا سر ماں کی گود میں رکھ دیا۔ ماں کی مرجھائی ہوئی انگلیاں اس کے بالوں میں اُلجھ گئیں۔

راکیش جھجکتا جھجکتا بولا "ماں ایک بات کہوں"؟

ماں بولی "کہو"۔

راکیش نے پوچھا "میں اپنے من پسند کی شادی کر لوں"؟

ماں کے جھریوں بھرے چہرے پر مسرّت کی تابانی چھا گئی۔ وہ بولی "بیٹا

میں تو اسی آس میں جی رہی ہوں۔"

رینو کا دبی دبی نگاہوں سے راکیش کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ مگر اس کی نگاہوں میں تیرنے والا تجسّس بالکل ہی نہیں دبا ہوا تھا۔"

راکیش پھر بولا۔" ماں! لڑکی ہماری ذات کی نہیں ہے۔"

ماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔" تم تو اس کے ساتھ خوش رہ سکو گے نا؟"

رینوکا کے باریک لبوں پر تبسّم کی ایک باریک کرن چھا گئی۔

راکیش بولا۔" ماں اس شادی کے بعد میری زندگی سکھی بن جائے گی۔"

ماں بولی۔" تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں تو تمہیں سکھی دیکھنا چاہتی ہوں بیٹا!"

رینوکا کے لبوں کا مہین تبسّم اب دلفریب مسکراہٹ کی خلعت پہن رہا تھا۔

راکیش بولا۔" ماں! ایک بات اور پوچھوں؟"

ماں نے کہا۔" پوچھو۔"

راکیش بولا۔" ماں اسے سماج اچھا نہیں سمجھتا لوگ کہتے ہیں نہ جانے وہ کتنی شادیاں کر چکی ہے۔"

ماں کا چہرہ اُداس ہو گیا اور وہ خاموش ہو گئی۔ راکیش اور رینوکا کی متجسّس نگاہیں اس کی بے نور آنکھوں پر جا ملیں۔

راکیش کے لہجہ میں منت اور پیار تھا۔ جب اُس نے کہا۔" بتاؤ نا ماں۔"

ماں رُکتے رُکتے بولی۔" تم تو اسے بُرا نہیں سمجھتے ہو؟"

راکیش اور رینوکا کے چہرے پر امید کی شعاعیں مچلنے لگیں۔ وہ بولا "نہیں ماں! میں تو اسے دیوی سمجھتا ہوں"!

ماں نے پوچھا "تمہیں تو وہ نہیں چھوڑ جائے گی؟"

راکیش بولا "اس کا تم قطعی فکر نہ کرو ماں!"

ماں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی "میں تمہاری خوشی میں خوش ہوں بیٹا!"

راکیش یک لخت اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس نے اپنی ماں کو گود میں اٹھالیا۔ وہ چلاتی رہی "کیا کر رہا ہے۔ مانتا نہیں۔ کہیں چوٹ لگ جائے گی"۔

کونے میں منہ چھپائے رینوکا مسکرا رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ماں کے چرنوں کو اپنے آنسوؤں سے دھو کر اپنی روح کو ان میں پیوست کر دے۔

راکیش اپنی ماں کو چارپائی پر بٹھا کر رینوکا کا کندھا ہلاتا ہوا بولا "کام بن گیا۔ مٹھائی کھلاؤ"۔ اور پھر وہ سیٹی بجاتا تیزی سے زینہ اتر گیا۔

رات جب خراٹے لے رہی تھی۔ اور راکیش اپنے کمرے میں سنہری سپنے رچتا رچتا نیند کی آغوش میں پینگیں لینے لگا تھا۔ اور رینوکا جب اپنی زندگی کی تاریکیوں کو چیرنے والی امید کی کرنوں سے کھیلتے کھیلتے خوابوں کی دنیا میں خود کو کھو چکی تھی راکیش کی ماں راہ ٹٹولتے ٹٹولتے اس کے بستر کے قریب آپہنچی۔ وہ رینوکا کے چہرے پر کانپتی ہوئی سوکھی سوکھی انگلیاں پھیرنے لگی۔ رینوکا کی آنکھ کھل گئی۔ وہ سہم گئی۔ ماں بڑبڑائی۔ "میری بہو کی شکل تو اچھی معلوم ہوتی ہے"۔ رینوکا اپنے بستر سے اٹھ کر ماں کے قدموں

سے لپٹ گئی۔

رینو کا نے گھر کو بنانے سنوارنے میں دن رات ایک کر دیا۔ آمدنی تو کوئی تھی نہیں۔ نوکر کو جواب دے دیا گیا۔ اب ہر چیز قرینے سے نظر آتی تھی۔ ماں کو کھانا وقت پر مل جاتا تھا۔ ہر کمرے میں فرنیچر اور دیگر رہائشی سامان با ترتیب دکھائی پڑتا تھا۔ اب رینو کا تخلیہ میں راکیش سے شرمانے لگی تھی۔ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر جب بھی راکیش کا سامنا ہوتا حیا اس کے رخساروں پر سرخی بن کر چھا جاتی۔ اس کی پلکیں جھک جاتیں۔ سانس گھٹنے سی لگتی۔ اور وہ بغیر کچھ کہے اُٹھ کر اپنے کمرہ میں آ کر ایک دم پلنگ پر گر جاتی۔ اور لمبی لمبی سانسیں لیتے مستقبل کے سنہری تانے بانے بُننے لگتی۔

چند دنوں سے راکیش پر پھر وحشت اور اُداسی کا دَورہ پڑ رہا تھا۔ وہ دن کو گیارہ بجے سو کر اٹھتا اور دو دو گھنٹہ شیو کا سامان سامنے رکھے آئینہ میں ویران نظروں سے اپنی شکل دیکھتا رہتا۔ اس کا شعور اپنی الجھنوں کی کڑیوں کو ٹٹولتا رہتا۔ پھر دفعتاً اُسے کچھ یاد آتا اور وہ چند لمحات ہی میں شیو سے فارغ ہو کر غسل کرتا اور کھانا شکم میں جلدی جلدی بھرنے کے بعد جس وقت آئینہ میں اپنی شکل دیکھتا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگتیں۔ ہونٹوں کی چمکیلی سطح بالکل ماند پڑ چکی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ ہلکے بہت نمایاں ہو گئے تھے۔ رخساروں کی تازگی عہد ماضی کے نقوش سے بھی زیادہ مدھم پڑ گئی تھی۔ گردن پر ہلکی ہلکی سلوٹیں نمودار ہونے لگی تھیں۔ اور اس کی شکل کا وہ مجموعی تاثر۔ وہ بھولا پن۔ وہ معصومیت۔ اس معصومیت کے وہ مقناطیسی پر تو نہ جانے کہاں پرواز کر گئے تھے۔ اس کی ماں حسب معمول راکیش

کے اس فطری تغیّر کو خاموشی سے برداشت کر رہی تھی۔ مگر۔ رینو کا گھبرا سی گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی۔ کہ راکیش کا دامن پکڑ کر اُسے پُوچھے کہ کیوں وہ آئے دن اس کی اور ماں کی زندگی کے سکون سے کھیلنے لگتا ہے۔ اُسے حق کیا ہے سب کو پریشان کرنے کا۔ جو انہیں محبت کرتے ہیں وہ ان سے ہی کھنچا کھنچا رہتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جو یہ چاہتے ہیں کہ ان کی اپنی زندگی خواہ خزاں کے تند شعلوں سے جھُلس جائے۔ مگر اس کی زندگی کی بہاروں پر آنچ نہ آئے۔ وہ انہیں کے جذبات کو قدموں تلے روندتا رہتا ہے۔ رینو کا کے دل میں گرجتے ہوئے طوفان اُمڈتے۔ اس کے شعور میں آندھیاں بلبلاتیں مگر اس کا ضبط ان طوفانوں کو اور ان آندھیوں کو اُبلنے سے روکے رکھتا۔ پھر وہ اپنے ہی اُوپر جھُنجلا اٹھتی۔ وہ اپنی طاقتِ برداشت پر جھلّا جاتی۔ یہ سوچتے سوچتے کہ کیوں نہیں وُہ راکیش کے اس خاموش جبر کے خلاف بغاوت کر دیتی۔ وہ خود سے سوال پُوچھنے لگتی ۔" کیا سچ مچ وہ اِتنی بزدل ہے۔ کیا سچ مچ عورت اِتنی کمزور ہوتی ہے۔ کیا سچ مچ محبّت اس نشتر کا نام ہے۔ جو انسان کی رگوں سے خودداری اور جرأت کے آخری قطرے تک نکال کر خاک میں مِلا دیتا ہے"۔ راکیش کو خوش رکھنے کے لئے جتنے بھی جتن تھے۔ بیکار ثابت ہو رہے تھے۔ اب اس کے مدہوش کر دینے والے نغمے راکیش کے لبوں پر ہلکے سے بھی تبسّم کو اجاگر کرنے میں ناکامیاب تھے۔ اس کی بے لوث خدمات کا اعتراف اب راکیش اپنی نگاہوں تک سے نہ کرتا۔ وہ سوچتے سوچتے بوکھلا اٹھتی۔ اور پھر وُہ اپنے بپھرے ہوئے جذبات کو یہ سمجھا کر چُپ کرا دینا چاہتی کہ جو شخص آج تک اپنی ماں کی زندگی سے کھیلتا رہا ہے۔ وُہ اسے کیا سکون دے سکے گا۔

رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ راکیش ابھی تک نہیں آیا تھا۔ رینوکا ماں کو سلانے کے بعد خود بھی سو گئی تھی۔ اچانک رینوکا کو احساس ہؤا کہ اس کے کمرے کے دروازے پر کوئی ہلکی ہلکی دستک دے رہا ہے۔ رینوکا گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا "کون ہے"؟

"میں ہوں دروازہ کھولو۔" جواب ملا۔

رینوکا "ماں جی" کہتے ہوئے ایک دم اٹھ بیٹھی۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ ماں کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے باہر چلنے والے طوفان کی تیز لہروں نے کمرے میں تیزی سے داخل ہو کر ایک ہنگامہ پیدا کر دیا۔

رینوکا اپنے آنچل کو طوفان کی گستاخیوں سے بچاتی ہوئی بولی۔ "آپ اس وقت تک جاگ رہی ہیں؟ باہر بڑی آندھی چل رہی ہے ماں جی!"

ماں نے کانپتے ہوئے لہجہ میں کہا۔ "راکیش نہیں آیا ہے۔ نہ جانے وہ کہاں ہو گا۔ میرا تو دل بیٹھ رہا ہے۔"

رینوکا نے ماں کو سہارا دے کر پلنگ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "طوفان بڑھتا جا رہا ہے۔"

ماں بولی۔ "آ جانے دو اسے۔ میں نے آج تک اسے کچھ نہیں کہا ہے۔ مگر آج میں چپ نہیں رہونگی۔"

رینوکا کو ماں کی بات کا کوئی یقین نہیں آیا۔

ماں کی ممتا نے خدشات کو جنم دیا۔ "اس طوفان میں کہیں وہ راستہ نہ بھول جائے۔"

رینوکا پھوٹ پڑی۔ "راستہ تو وہ ماں جی کبھی کے بھولے ہوئے ہیں۔ آپ کے پیار نے اور آپ کی خاموشی نے انہیں کبھی راستہ تلاش کرنے کی سوجھ بوجھ ہی نہیں دی۔"

ماں بڑبڑائی۔ "سچ کہتی ہو بیٹا مگر اب میں چپ نہیں رہونگی۔"

صحن کے دروازے دھڑ دھڑا کر گرج اٹھے۔

رینوکا بولی۔ "اُف! کتنا طوفان ہے۔"

دروازے پھر گرجے۔

ماں بولی "نیچے جاؤ رینوکا۔ دروازہ کھولو۔ راکیش آگیا ہے۔"

رینوکا تیزی سے زینہ اترتے ہوئے صحن میں جا پہنچی۔ اس نے دروازے کھول دئے۔ راکیش نے گرد و غبار کے بگولوں کے ہمراہ صحن میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ماں جی جاگ رہی ہیں"؟

رینوکا صحن کے دروازے آندھی کے سر پر دھکیل کر بند کرتی ہوئی بولی۔

"جی ہاں! اس وقت وہ میرے کمرے میں ہیں۔"

راکیش بالائی منزل پر آگیا۔ رینوکا بھی زینہ چڑھ آئی۔

راکیش اس کے کمرے میں داخل ہوتا ہوا بولا "کتنا اندھیرا ہے۔ لالٹین جلاؤ۔"

رینوکا لالٹین جلانے کی کوشش کرنے لگی۔ دیا سلائی کی کتنی ہی تیلیاں بجھ گئیں۔

راکیش بڑبڑایا "طوفانوں میں چراغ بڑی مشکل سے جلتا ہے۔"

رہنو کا سہم گئی۔ راکیش کا لہجہ خطرناک حد تک گھمبیر تھا۔

راکیش پھر بڑبڑایا۔ "جلدی جلاؤ لالٹین"!

لالٹین کی زرد شعاعیں گرد و غبار سے بھرے ہوئے کمرے کی تاریک فضا میں الجھ کر رہ گئیں۔ "بیٹا! اتنی دیر کہاں لگا دی"؟ پوچھتے پوچھتے ماں سسکیاں بھرنے لگ پڑی۔ اس کے وہ سب عزم کہ آج وہ راکیش کے ساتھ سختی کے ساتھ پیش آئے گی۔ ایک ایک کر کے ویران آنکھوں کے آنسوؤں میں بہنے لگے"!

راکیش بولا "ماں! رومت۔ میں نے آج تم سے بہت باتیں کرنی ہیں"۔

راکیش کے لہجہ کی گھمبیرتا کا احساس کر کے ماں بھی سہم گئی۔ وہ بولی "کہو"!

راکیش بڑبڑایا "میں نوکری اب کبھی نہ کر سکونگا۔ میرے جسم میں کام کرنے کی طاقت ہی نہیں رہی ہے۔ گھر کی پونجی ختم ہو چکی ہے۔ مجھے کم از کم شراب کے لئے تو ہر روز روپیہ چاہیئے۔ یہ روپے کہاں سے آئیں گے۔ میں تمہارے لئے ایک ناقابل برداشت بوجھ بن کر رہ گیا ہوں۔ ماں! یہ تو بتاؤ۔ تم میرے بغیر زندہ رہ سکو گی"؟

ماں سسکتے سسکتے بولی "کیسی بدشگونی کی باتیں کر رہے ہو۔ کبھی بیٹے بھی بوجھ ہوتے ہیں"؟

راکیش کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا "بیٹے نہ بوجھ ہوتے ہونگے ماں! مگر میری زندگی آج میرے لئے بوجھ ہی نہیں وبال بن گئی ہے"۔

ماں کی سسکیوں کا گلا گھبراہٹ نے گھونٹ دیا۔ وہ بولی "کیا بات ہے بیٹا"؟

راکیش کے خشک لہجہ نے الفاظ اگلے "آج میری شادی کی بات چیت ٹوٹ

گئی ہے"۔

ماں نے پوچھا "کیوں آج رینو کا نے کچھ کہا ہے"؟

تلخ تبسم راکیش کے لبوں پر چند لمحات کے لیئے آکر اڑ گیا۔ وہ بولا "رینو کا مجھ سے کیا کہہ سکتی ہے۔ آج مجھے قطعی جواب مِل گیا ہے۔ امید کے جن کچے دھاگے کے سہارے آج تک جی رہا تھا۔ وہ ٹوٹ گیا ہے"۔

ماں نے شفقت آمیز جھنجلاہٹ میں پوچھا "آخر ہوا کیا"؟

راکیش نے ڈوبتے ہوئے لہجہ میں جواب دیا۔ "اس کی ماں نے کہا ہے تمہارے جیسے کتنے ہی کنگال روز اس گلی کے چکر لگاتے رہتے ہیں۔ پلّے میں پیسہ نہیں۔ اور خواب پریوں کے دیکھتے ہیں۔ یہی نہیں۔ اس کی ماں جب انگارے برسا رہی تھی۔ وہ کھڑی قہقہے لگا رہی تھی۔ بڑے تلخ تھے وہ قہقہے"۔

گھبرائی ہوئی ماں نے پوچھا۔ "وہ کون"؟

راکیش چونکتا ہوا سا بولا "حمیدہ۔ جس کی گلی کے ایک برس سے چکر لگا رہا ہوں۔ جس نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔ جس کو گھر لانے کی اجازت ماں! دو مہینے ہوئے تم سے لی تھی"!

کمرے کا ہی نہیں گویا کمرے سے باہر بھی بلبلانے والے طوفان کا تمام گرد و غبار رینو کا اور راکیش کی ماں کے دماغ میں یک لخت بھر گیا تھا۔

راکیش اور کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کے ناک پر پسینہ کی بوندیں اُبھر آئیں اور پھر وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرتا ہوا باہر چل پڑا۔

ماں نے عالمِ حیرت اور تذبذب سے آزاد ہوتے ہوئے پوچھا۔ "کہاں جا

رہے ہو بیٹا!"

"اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ رات بہت ہو گئی ہے"۔ جواب ملا۔

ماں رینوکا سے رجوع ہوئی۔ "جاؤ رینوکا راکیش کے کمرے کا لیمپ جلا آؤ"۔

رینوکا بھی راکیش کے پیچھے پیچھے زینہ اتر گئی۔

جب رینوکا کمرے میں روشنی کرنے کے بعد واپس لوٹنے لگی تو راکیش نے میز پر رکھے کھانے پر اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں کھانا نہیں کھاؤں گا"۔

رینوکا خاموش رہی۔

راکیش کے لہجہ میں محبت کھنک اٹھی جب وہ بولا۔ "رینو"۔ آج اس نے رینوکا کو پہلی دفعہ رینو کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

رینوکا کے قدم جہاں تھے وہیں بندھ گئے۔

راکیش اس کے قریب آتا ہوا بولا۔ "رینو آج تم تو میری باتیں سن لو"۔ اور یہ کہہ کر اس نے رینوکا کا بازو پکڑ کر اسے کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ خود پلنگ پر بیٹھ گیا۔ رینوکا زمین کی طرف دیکھتی ہوئی پاؤں کے انگوٹھے سے فرش کریدنے لگی۔

راکیش نے تھرتھراتے ہوئے لہجہ میں اعتراف کیا۔ "میں تمہارا بھی گنہگار ہوں رینو"۔

رینوکا کی آنکھیں نم ہوتے ہوتے رہ گئیں۔ اس کے لب وفور یاس سے پھڑپھڑا اٹھے۔

راکیش نے پھر اعتراف کیا۔ "مجھے احساس ہے کہ میں نے آج تک تمہاری محبت اور تمہارے تپاگ کا جواب ہمیشہ بے رخی سے دیا ہے"۔

رینو کا کا سر جھکا ہی رہا۔

راکیش پھر بولا۔ "اگر تمہاری محبت کا دل فراخ ہے تو میرے گنا ہوں کو بخش دو۔ آج میں خود کو بہت بے بس اور بہت ناکارہ محسوس کر رہا ہوں"۔

رینو کا نے بھیگی ہوئی پلکوں سے ایک دفعہ راکیش کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اور پھر گردن جھکا لی۔ راکیش کی نگاہیں لیمپ کی زرد کرنوں سے اُلجھ گئیں۔ اُس نے سوچتے سوچتے پوچھا۔ "تم میرے مردہ ارمانوں کی امانت دار ہو گی رینو؟"

رینو کا سوالیہ نگاہوں سے راکیش کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

راکیش پھر بولا۔ "تم میری ہو گی رینو؟" اور اتنا کہتے کہتے وہ گڑگڑانے لگا۔ "تم میری بن جاؤ رینو۔ آج میں محض تنہا ہی نہیں ہوں بہت بلندی سے بھی گرا ہوں"۔

راکیش کے لہجہ میں دِل ہلا دینے والا درد تھا۔ رینو کا کرسی سے اٹھی۔ اور راکیش کے قدموں سے لپٹ گئی۔ اس کے گھُٹے ہوئے جذبات چیخیں بن کر اُبل جانا چاہتے تھے مگر آدابِ ضبط ان کو سنبھال رہے تھے۔ اس نے سسکتے سسکتے راکیش کے زانو پر اپنا سر رکھ دیا۔ راکیش اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہ بہ کر اس کی مانگ میں رچنے لگے۔

وہ بڑی گمبھیر آواز میں بولا۔ "شادی۔ وفاداری کا نام ہے شادی۔ زندگی بھر کی رفاقت کے پاک عہد کا نام ہے۔ مَیں تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔ بولو۔ تم میری ہو گی رینو؟"

رینو کا کی گرفت راکیش کے قدموں پر سخت ہو گئی۔ مگر وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکی۔

راکیش نے اٹھتے ہوئے فیصلہ دیا۔ "اٹھو۔ ہماری شادی آج ہی ہوگی۔ اسی وقت ہوگی۔ میں کافی دن بھٹک لیا ہوں۔ میں سکون چاہتا ہوں۔ اپنے رچائے ہوئے فریبوں کے تلے میری روح اب اور زیادہ دبی رہنے سے لاچار ہے۔"

راکیش اور رینو کا نے بالائی منزل پر آکر دیکھا۔ ماں سرہانے میں سر چھپائے لیٹی ہوئی سسکیاں بھر رہی تھی۔ راکیش نے رینو کا کو اشارہ کیا۔ دونوں اس کے قدموں میں آگرے۔

راکیش گڑگڑایا۔ "ماں اپنے گنہگار بیٹے کو بخش دو۔" ماں چارپائی پر سنبھل کر بیٹھ گئی۔ وہ سسکیاں بھرتی ہوئی بولی۔ "تم کس بات کے گنہگار ہو بیٹا! تم اداس نہ ہو۔"

راکیش رکتا رکتا بولا۔ "مجھے آشیرباد دو ماں!"

ماں راکیش کی بات پوری سنے بغیر بول اٹھی۔ "میں تو تمہیں دن رات آشیرباد دیتی ہوں"۔

راکیش بولا۔ "نہیں ماں! آج میں بہت بڑی بات کے لئے آشیرباد لینے آیا ہوں۔ میں رینو کا سے شادی کر رہا ہوں"۔

ماں کا دماغ چکرا سا گیا۔ اس کے ماتھے کی جھریاں اور بھی گہری ہوگئیں۔ وہ بولی۔ "ابھی کیا سوانگ رچا رہے تھے اور اب کیا فیصلہ لے کر آگئے ہو۔ کیا ہوگیا ہے تمہیں"؟

راکیش بولا۔ "میری ماں کی دیکھ ریکھ کے لئے کوئی بہو چاہیئے۔ میں خود تو ناکارہ

ثابت ہوا ہوں نا؟"

ماں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی "نہیں کون ناکارہ کہتا ہے"۔
اور پھر وہ رینوکا کو ٹٹولتے ہوئے بولی "بہو! زمین پر کیوں بیٹھی ہو۔ اٹھو یہ کوئی
گڈے گڑیا کا بیاہ ہے جو ایسے آ بیٹھے۔ بارات سجے گی۔ نفیریاں بجیں گی۔ بھائی
برادری اکٹھی ہوگی۔ تمہاری گود بھری جائے گی"۔

راکیش بولا "یہ کچھ نہیں ماں! مجھے ان واہیات رسموں میں رتی بھر یقین
نہیں ہے۔ میں تیار ہوں۔ رینوکا خوش ہے۔ اب صرف آپ کے چرنوں کی دھول
سر پر رکھنی تھی وہ رکھ لی"۔

ماں کے چہرے کی سلوٹیں ہموار ہوتی جارہی تھیں۔ مسرت اس کے چہرے
پر تابانی بن کر جھلک رہی تھی۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی "میں بھی کتنی اندھی ہوں۔
میرے بیٹے نے اتنا بڑا فیصلہ کیا ہے۔ میری بہو میرا آشیرباد لینے میرے
پاس آئی ہے اور میں خالی ہاتھ بیٹھی ہوں۔ ابھی گڑ لاتی ہوں"۔

ماں کے معلوم ہوتا تھا چار آنکھیں لگ گئی ہیں۔ وہ اتنی تیز آندھی میں بھی
اپنے کمرے سے بہت جلد گڑ لے کر لوٹ آئی۔ اس نے رینوکا کے پلّے میں شگون
ڈالنے کے بعد اپنی انگوٹھی اس کے ہاتھ میں پہنادی۔

راکیش اپنا سر ایک بار پھر ماں کے قدموں پر رکھنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔
وہ انگڑائی لیتا ہوا بولا "بہت رات ہوگئی ہے ماں! اب میں جاتا ہوں"۔ اور وہ
اپنے کمرے میں آگیا۔

رینوکا ماں کے قدموں سے لپٹ گئی۔ وہ روندھے ہوئے گلے سے بولی۔

"ماں جی! انہیں آشیرباد دیجئے۔ وہ اتنے بُرے نہیں ہیں"۔

آندھی کم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ صحن کا دروازہ جھکڑ کی تاب نہ لاکر بار بار گڑگڑا اٹھتا تھا اور اب تو بادل بھی گرجنے لگ پڑے تھے۔ صحن میں روشنی ہوتی۔ اور بجلی کی کڑک سے مکان لرز اٹھا۔ رینوکا کی آنکھ کھل گئی۔ ماں تو پہلے ہی جاگ رہی تھی۔

رینوکا نے آہستہ سے آواز دی۔ "ماں جی"!

"کیا ہے بہو"؟ جواب ملا۔

رینوکا سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ "مجھے تو ڈر لگ رہا ہے ماں جی!"

"بھگوان کا نام لو بہو۔ ڈر کس بات کا ہے"؟ ماں نے تشفی دی۔

نچلی منزل سے آواز آئی۔ کھٹ۔ کھٹ۔ کھٹ۔

سہمی ہوئی رینوکا اور سہم گئی۔ اُس نے پوچھا۔ "یہ آواز کیسی ہے ماں جی؟"

"غسل خانہ کی ٹین بول رہی ہوگی"۔ ماں نے مزید تشفی دی۔

پھر آواز آئی ... کھٹ۔ کھٹ۔ کھٹ۔ اِس بار آواز تیز تھی۔

رینوکا اور بھی گھبرا گئی۔ وہ بولی۔ "ماں جی! یہ تو کوئی نقب لگا رہا ہے"۔

ماں بھی اس بار گھبرائی ہوئی بولی۔ "اب تو مجھے بھی کچھ ایسا ہی شک ہونے لگا ہے"۔ اور پھر وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد خود ہی بڑبڑائی۔ "راکیش تو گھوڑے بیچ کر سوتا ہے معلوم ہوتا ہے۔ اس کی آنکھ نہیں کھلی ہے"۔

پھر آواز آئی۔ اور اس بار آواز نہایت کرخت تھی۔ کھٹ کھٹ کھٹ۔ کھڑاک۔

ماں اپنے بستر پر سنبھل کر بیٹھ گئی۔ وہ چلائی۔ "بہو لالٹین جلاؤ۔ یہ تو کسی نے

دیوار پھاڑ دی"۔ کہتے کہتے وہ راکیش کو زور زور سے آوازیں دینے لگ پڑی۔

رینوکا نے لالٹین جلائی ——— آواز آئی۔۔۔۔ دھڑام ——— اور پھر ایک چیخ۔

رینوکا لالٹین اٹھا کر نچلی منزل کی طرف بھاگی۔ راکیش اپنے کمرے میں نہیں تھا۔ رینوکا کی بے چین نگاہوں نے ایک لمحہ ہی میں کونہ کونہ کا جائزہ لے لیا۔ داہنی طرف کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ لیمپ کی مدھم زرد شعاعیں بھی اس کمرہ کی تاریکی کا سینہ چیر کر ابھر رہی تھیں۔ رینوکا اس کمرہ کی طرف جھپٹی۔ اس کی چیخ نکل گئی۔

ماں زینہ میں سے چلائی "کیا ہے بہو؟"

ماں کے اس سوال کے جواب میں رینوکا کی ایک اور چیخ لرز اٹھی۔ ماں کمرے میں داخل ہوتے ہوتے بولی "بہو! مجھ اندھی کو بھی بتاؤ کیا ہوا ہے؟"

راکیش کے والد کا بُت ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا۔ اس کا دھڑ راکیش کے سینے کو چیر کر اس میں پیوست ہو گیا تھا۔ اس کا سر راکیش کے پھٹے ہوئے سر میں دھنسا ہوا تھا۔ چھوٹے چھوٹے سنگ ریزے راکیش کا خون چوس کر سرخ ہو گئے تھے ——— راکیش کے بے جان ہاتھ کی گرفت ابھی تک اس آہنی ہتھوڑے پر سخت تھی۔

نصف بے ہوش رینوکا بمشکل تمام کہہ سکی "وہ مر گئے ہیں!" اور اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ ماں کے جذبات۔ اس کے احساسات۔ اس کا شعور ایک لمحہ ہی میں مفلوج سے ہو گئے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ابھی بارات تو آئی نہیں۔ برادری اکٹھی نہیں ہوئی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" جواس باختہ ماں چلائی۔

اچانک رینو کا کی نگاہیں راکیش کے چہرہ کی طرف گیئں۔

موت اور نزع کی تمام وحشت اور کرختگی اس پر سمٹ آئی تھی اور اس کے قریب ہی راکیش کے خون میں رنگا ہوا بُت کا ٹوٹا ہوا چہرہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

آنسو اور موتی

گھر کا گھر خوش تھا۔ دہلی سے دیو دت کے آنے کی اطلاع تار کے ذریعے تین
دن ہوئے مل چکی تھی۔ پنڈت اندر کمار۔ ان کی بڑھیا بیوی اور ان کی تینوں لڑکیاں
آشا۔ لتا اور مالتی آنکھیں بچھائے اس کے انتظار میں تھیں۔ لمبے سے بانس
کے سرے پر آشا کے پھٹے ہوئے جمپر کو لپیٹ کر کھڑکیوں۔ دیواروں کے کونوں اور
چھت سے لٹکتے ہوئے لوہے کے کنڈوں پر سے مکڑی کا جالا صاف کیا گیا۔
برتنوں کو آم کی کھٹائی سے صاف کیا گیا۔ پڑوس کے لالہ وشو بندھو کے یہاں سے
چائے کا سیٹ مانگا گیا۔ فرشوں کی دھلائی کی گئی۔ آشا۔ لتا اور مالتی کی کشیدہ کی
ہوئی بستر کی چادریں ٹرنک سے نکالی گئیں۔ چیڑھ کی ہلکی پھلکی چیزوں اور تپائیوں
پر گہرے سرخ اور نیلے پھولوں والے میز پوش بچھائے گئے۔ دیواروں پر لٹکی ہوئی کرشن
رام شیواجی۔ مہارانا پرتاپ۔ مہاتما گاندھی اور بھگت سنگھ کی تصویروں کے گرد
آلودہ چوکھٹوں اور مکھیوں کی غلاظت سے بھرے ہوئے شیشوں کو صاف کیا گیا۔
صحن میں رکھے ہوئے تلسی کے گملے پر گیرو کا لیپ کیا گیا۔ تین دن تک پورا کنبہ اس

چھوٹے سے گھر کو سجانے میں ہلکان ہوتا رہا ——— آج دیودت نے اپنی نئی
کی کار پر آنا تھا۔ پنڈت انند کمار نے میونسپلٹی سے چھٹی لے لی تھی۔ ان کا ناریل
کا حقّہ بڑھیا نے ٹرنکوں کے پیچھے چھپا دیا تھا۔ اور ان کی شادی میں جو مراد آبادی
فرشی انہیں ملی تھی وہ صاف کر کے دھو کے آشا نے صبح صبح ہی بھر دی تھی۔ اور
اب وُہ اس چھوٹے سے دالان میں بیٹھے لمبے لمبے کش لے رہے تھے۔ ———

بار بار ان کی نگاہیں دروازے کی طرف اٹھ جاتیں۔

کار کی آواز آئی ——— پورا کنبہ صحن میں جمع ہو گیا اور انند کمار اپنا حقّہ
چھوڑ کر گلی میں نکل آئے۔ کچھ دیر بعد کھدر کی اکڑی ہوئی سفید نوکیلی گاندھی ٹوپی۔
گھدر کا کرتہ۔ کھدر کی باریک دھوتی میں دیودت پنڈت جی کے ساتھ صحن میں داخل
ہُوا۔ آشا کو کچھ دھکا سا لگا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ دیودت سُوٹ بوٹ میں ملبوس
ٹائی عینک لگائے ہوگا۔ لڑائی اور لڑائی سے پہلے وہ یہ کپڑے نہ پہنتا تھا مگر اس دیودت
اور اس دیودت میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ وہ دیودت سانولا رنگ ہونے کے
باوجود بالکل انگریزوں کی طرح رہتا اور بولتا۔ کانٹے چھری سے کھانا کھاتا۔ اور یہ
دیودت تو اچھا خاصا نیتا معلوم ہوتا تھا۔ نیتاؤں کی طرح اس نے گہرے نیلے رنگ
کی بھاری فریم والی عینک لگا رکھی تھی۔ پاؤں میں سادہ سی چپل تھی۔ آستینوں پر
سے کرتہ مڑا ہُوا تھا۔ اور تو اور اب وہ باتیں بھی آہستہ آہستہ اور تول تول کر کرتا تھا۔
وہ زبان جو کبھی قینچی کی طرح چلتی تھی۔ اب اٹکی اٹکی جا رہی تھی۔ اور پھر آشا نے اپنے
دل کو سمجھا لیا۔ وہ زمانہ اور تھا۔ اب یہ زمانہ اور ہے۔ اس وقت انگریزوں کی
حکومت تھی۔ سُوٹ بوٹ کی اپنی ہی شان تھی۔ کھدر پوشوں کی قدر آشرموں اور

جیل خانوں میں بھلے ہی ہو گی ورنہ نچلے طبقے میں انہیں کون پوچھتا تھا۔ اور آجکل تو کانگریس کی حکومت ہے۔ اوروں کی چاہے نبھ جائے۔ دیودت جیسے بڑے کارخانہ دار کی تو دال بنا گاندھی ٹوپی اور کھدر کے کپڑوں کے نہیں گل سکتی ــــ

اور پھر پورا کنبہ دیودت اور دیوونت کے ڈرائیور کی خاطر تواضع میں لگ گیا

رات ہو گئی۔ کھڑکی میں ہری کین لالٹین کی مدھم شعاعیں کمرے کی تاریکی کو چیرتے چیرتے پیلی پڑ چکی تھیں۔ ایک چارپائی پر پنڈت اندرلکمار اور ان کی شریکِ حیات بیٹھے تھے۔ اور دوسرے پلنگ پر دیودت ایک موٹے سے گاؤ تکیہ کا سہارا لگائے اسٹول پر رکھے ہوئے اپنے 555 کے سگرٹ کے ڈبے پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ بولا "میں تو آشا کے بارے میں سن کر حیران رہ گیا ہوں۔ ابھی پچھلے برس انہیں دنوں میں تو اس کی شادی ہوئی تھی۔ اور ایک سال ہی میں یہ سب ہنگامہ ہو گیا"

پنڈت جی تو خاموش ہی رہے۔ مگر ان کی شریکِ حیات گویا اُبل سی پڑی۔ "وہ آشا جیسی لڑکی ہزار ہزار کوس تک نہیں ہو گی۔ سگھڑ۔ نیک۔ گرہستی کے کاموں میں چتر۔ یہ بستر کی چادریں اُسی کی کڑھی ہوئی ہیں۔ ناک نقشہ تو تم نے دیکھا ہی ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا کبھی کسی نے اس کی آنکھ اوپر اُٹھتی نہیں دیکھی۔ مگر اُس پر کون سا ظلم سسرال والوں نے نہیں ڈھایا۔ قسم ہے بھگوان کی یہ تو نہ جانے کب کی مر جاتی اور ہمیں پتہ تک نہ چلتا۔ وہ تو خیریت گذری کہ ہمارے پڑوس کے منشی بھگوان داس ایک دن رات کو بارہ بجے اچانک اس کے سسرال والوں کے گھر کے سامنے سے نکلے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ڈیوڑھی کے باہر کوئی کراہ رہا

ہے۔ پہلے تو وہ یہ سوچ کر دور نکل گئے۔ کہ کون پرائی بلا اپنے سر لے۔ مگر کانوں کو کچھ ایسی کھٹک سی ہوئی۔ کہ کراہنے کی آواز تو آشا ہی کی ہے۔ ایک دم واپس لوٹے۔ اور اپنے پلّے سے کرایہ کا تانگہ کر کے لڑکی کو گھر لے آئے۔ میں نے دیکھا جسم پر جگہ جگہ نیل پڑے ہوئے تھے۔ ناک کے پاس سے خون جاری تھا۔ داہنی آنکھ سوجی ہوئی تھی۔ پنچی دیو کیا ملا یم راج مل گیا۔ بہت تسلی دلاسہ دے کر پوچھا تو پتہ چلا۔ کہ کرپارام تو آٹھ مہینے سے یہ کارنامے کر رہا ہے۔"

دیودت کے چہرے پر سنجیدگی کرآہ اٹھی۔ وہ بولا۔ "مگر کرپارام کو آشا سے اتنی نفرت کیوں ہو گئی"؟

بڑھیا نے جلدی سے کہا "لو یہ بھی سن لو۔ مجھے تو اب پتہ چلا ہے اس کرپارام کی حرکتوں کا۔ شادی سے پہلے یہ سب معلوم ہو جاتا۔ تو آشا کے نصیب کیوں پھوٹتے۔ وہ ہمارے ہاں شادی کرانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ کالج کی کسی لڑکی سے بات چیت ہو گئی تھی۔ وہ تھی دوسری ذات کی۔ ماں باپ کو پتہ چلا تو سر پیٹ کر رہ گئے۔ اڑھائی گز کی ناک کہیں برادری میں نہ کٹ جائے۔ اسی سوچ میں پڑ گئے۔ لڑکے کو ڈرا دھمکا کر دوسری جگہ شادی کرنے پر رضامند کر لیا۔ اور نصیب ہمارے پھوٹ گئے۔"

دیودت نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھا۔"

بڑھیا آگے بڑھی۔ "اور اب تو وہ کہتے ہیں دھوتی اور دانتوں میں تنکا لے کر بھی میری ڈیوڑھی چڑھیں۔ تو میں لڑکی کو نہیں بھیجتی۔"

پنڈت جی بیچ میں بول پڑے "تم بھیجنا بھی چاہو تو اب لے جاتا کون ہے"۔

بڑھیا نے کہا۔ "نہ بابا! میں اپنے جیتے جی گئو کو قصائی کے آگے نہیں پھینکوں گی"۔

دیودت نے کہا" میرا بھی خیال یہی ہے کہ اب آشا کو سسرال نہیں جانا چاہیئے۔"

پنڈت جی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا" لڑکی کو روٹی تو بادشاہ بھی نہیں دے سکتے دیودت جی!"

دیودت بول اٹھا" کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ پنڈت جی! آخر آپ کا مجھ پر بھی تو کچھ حق ہے۔ میرے ہوتے آپ کو ایسی باتیں نہیں کہنی چاہئیں"۔ پنڈت جی سونی سونی نظروں سے دیودت کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکے۔ ان کی ویران نگاہیں کہہ رہی تھیں" تم اتنے امیر ہوتے ہوئے بھی کتنے شریف ہو۔ آجکل کے زمانہ میں کون امیر آدمی اپنی برادری والوں کو پہچانتا ہے۔ تم جُگ جُگ جیو۔ بھگوان تمہیں سو برس کی عمر دیں۔"

بڑھیا نے رکتے رکتے پوچھا" بیٹا! بھگوان نے کوئی لال بھی دیا؟ تجھ تو بھورانی کو ملے زمانہ بیت چکا ہے۔"

دیودت کے لبوں پر خزاں کی تلخی کانپ اٹھی۔

بڑھیا بے چین سی ہو کر بولی۔" جواب نہیں دیا بیٹا!"

دیودت بولا" آپ کی بہو کو میکے گئے تین برس ہو گئے ہیں۔"

بڑھیا نے متعجب ہوتے ہوئے کہا۔" یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

دیودت اور بھی سنجیدہ ہو گیا اور بولا" اس کے مزاج کی گرمی اور اس کے چلبلے پن نے اسے میرے ساتھ نہ رہنے دیا۔"

بڑھیا بھی اتنی ہی سنجیدگی سے بولی" پھر بھلا گھر کیسے بستا۔ عورت کے مزاج کی گرمی تو اچھی سے اچھی گرہستی کو پھونک کر رکھ دیتی ہے۔ ہاں اور بچہ کوئی

نہیں ہوا؟"

دیودت نے قدرے بے نیازی سے جواب دیا۔ "لڑکا ہے دس برس کا۔ وہ لکھنؤ میں پڑھتا ہے"۔

بڑھیا نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "بھگوان اس کی لمبی عمر کرے"۔

منصوری سے تار آیا۔ "آپ کنبے سمیت آ جائیں"۔ اور ساتھ ہی دو سو روپے بھی آ گئے۔ پنڈت جی تو پہلے ہی دفتر سے چھٹی پر تھے۔ بائیس سال کی نوکری میں انہوں نے پہلی بار یہ چھٹی لی تھی۔ دیودت کا تار اور پھر ساتھ روپیہ ـــــ وہ کنبے سمیت منصوری آ پہنچے۔

پہلے وہ سنا کرتے تھے کہ دیودت رئیس ہے۔ ایک بڑا کارخانہ دار ہے۔ اور اب دیکھ رہے تھے کہ امیری کیا چیز ہے۔ قالین۔ صوفہ سیٹ۔ ریڈیوگرام ریشمی پردے۔ درجن بھر نوکر۔ خوبصورت قیمتی پلنگ۔ نرم و نازک گدوں والی کرسیاں۔ ـــــ پنڈت جی بہشت میں آ پہنچے تھے۔

ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ سامنے والی پہاڑ کی چوٹیوں پر اودی گھٹائیں جھول رہی تھیں۔ وادی میں دھند چھائی ہوئی تھی۔ ہلکے پھلکے سفید بادل کوٹھیوں میں گھس آئے تھے۔

پنڈت جی اور سب لوگ سیر کو گئے ہوئے تھے۔ دیودت دوپہر ہی سے کسی دوست کے ہاں کھانے پر گیا ہوا تھا۔ اور آشا سر درد کی وجہ سے گھر ہی پر رہ گئی تھی۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے تھک سی گئی تھی۔ اور اب برآمدے میں آ

بیٹھی تھی ——— وہ بہت دیر تک اس وسیع خلا کی طرف دیکھتی رہی جو میلوں دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ اور اب جس میں سفید اور کالے ابر پارے تیر رہے تھے۔ اس کی اپنی زندگی ایک وسیع خلا تھی۔ جس میں بنتی اور بگڑتی تمناؤں کے ابر پارے بارہا چھا جاتے تھے۔ اور پھر اس کی پلکوں سے بُوندا باندی ہونے لگتی تھی۔ ایسی خاموشیوں میں اکثر اس کا شعور ماضی کی ہولناکیوں پر سے جب جب بھی نقاب اٹھانے لگتا۔ وہ گھبرا کر آنکھیں مُوند لیتی۔ اور پھر حال کی پیچیدہ پگڈنڈیاں مستقبل کی اُن وسیع غاروں کی طرف رینگتی دکھائی پڑنے لگتیں۔ جن میں اُسے لاتعینی ڈراونے چہرے چیختے نظر آتے۔

پلکیں بُوندا باندی کر رہی تھیں۔ جذبات گرج رہے تھے۔ اور سامنے کی وسیع خلاؤں میں دوڑتے دوڑتے اس کی نظریں تھک چکی تھیں۔ اُسے علم بھی نہ ہوا کہ دیودت کب اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا ہے۔ اور پھر جب اُسے اس کی موجودگی کا علم ہوا۔ اُس نے جلدی سے آنکھیں پُونچھ لیں۔ جذبات کی گرج دل کی ویرانیوں میں گھٹ کر رہ گئی۔ اور وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

دیودت نے پُوچھا۔ "یہ آنسو!" اور اس سے زیادہ وہ کچھ نہ بولا۔

آشا پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے بولی۔ "ہاں"

دیودت نے کہا۔ "آپ بیٹھئے۔ سب لوگ کہاں ہیں؟"

آشا نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ابھی سیر سے واپس نہیں آئے۔"

دیودت بھی ایک بید کی کرسی کھینچ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ بھی کچھ دیر تک بادلوں سے بھری ہوئی وادی کی طرف دیکھتا رہا۔ اور پھر آہستہ آہستہ بولا۔

"ایسے موسم میں اکثر بھولی بسری یادیں تازہ ہو جاتی ہیں"۔
آشا محض "جی" کہہ کر خاموش ہو گئی۔

دیودت پھر کچھ دیر کے لئے خاموش ہو رہا۔ اور پھر بولا "مجھے معلوم ہے جس آگ میں آپ کا دل جل رہا ہے"۔

آشا کے ہونٹوں پر بے بسی کانپ اٹھی۔ بے چارگی اس کی نگاہوں میں آنسو بنتے بنتے رہ گئی۔

دیودت وسیع خلاؤں کی طرف دیکھتا ہوا بولا "آپ کی زندگی کا سونا پن کتنا بھیانک ہے۔ اس کا اندازہ میں اپنی ویران زندگی سے لگا سکتا ہوں"۔

آشا اس بات کا بھلا کیا جواب دیتی۔

دیودت نے کہا۔ "میں اکثر جو سوچتا ہوں الٹا ہو جاتا ہے۔ میں تو آج آپ کے لئے موتیوں کے آویزے لایا ہوں"۔ اور موتیوں کے آویزے جیب سے نکال کر دیودت نے آشا کی طرف بڑھائے۔

آشا نے ایک اچٹتی سی نظر آویزوں پر ڈالی۔ ہزاروں تمناؤں کی مایوسیاں اس کے چہرہ پر لہرا اٹھیں۔ اور وہ محض اتنا ہی کہہ سکی "پتا جی کو آنے دیجئے"۔

دیودت نے آویزے جیب میں رکھ لئے۔ اور وہ پھر لباس تبدیل کرنے کے لئے اپنے کمرے میں آ گیا۔ آشا جوں کی توں بیٹھی رہی۔

جب پنڈت جی مع اپنے بال بچوں کے سیر سے واپس آئے تو کوٹھی میں چہل پہل سی ہو اٹھی۔ کھانا کھانے کے بعد جب بارش کافی تیز ہو گئی تھی اور سامنے والی خلاؤں میں اندھیرا بھر چکا تھا۔ دیودت۔ پنڈت جی اور سب لوگ برآمدہ میں کرسیوں

پر آ بیٹھے تھے۔

دیودت نے پھر بات چھیڑی۔ "آج جب صبح میں واپس آیا تو آشا رو رہی تھی"۔

بڑھیا کا چہرہ اُتر گیا۔ پنڈت جی بہت سنجیدہ ہو گئے۔ لتا اور مالتی آشا کے چہرے کی طرف دیکھنے لگ پڑیں۔

بڑھیا نے کہا۔ "اس کے دکھ کو میں ہی جانتی ہوں"۔

دیودت کی سنجیدگی قدرے اُداسی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ "آج میں آشا کے لئے موتیوں کے آویزے لایا تھا" دیودت نے آویزے جیب سے نکالے سب کی نگاہیں موتیوں پر گڑ گئیں۔

بڑھیا نے کہا۔ "یہ تو بہت قیمتی معلوم ہوتے ہیں"۔

دیودت کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

بڑھیا نے آشا سے کہا۔ "لو دیکھو تمہارے لئے یہ کیا اچھا تحفہ لائے ہیں۔ لو پہنو انہیں"۔

آشا نے محض اتنا ہی کہا۔ "پہن لونگی"۔

بڑھیا نے دیودت سے آویزے لے کر آشا کو دیتے ہوئے کہا۔ "ہر وقت اُداس نہیں رہتے۔ لو پہنو"۔

آشا نے چُپ چاپ آویزے لے لئے۔

بڑھیا نے اصرار کیا۔ "ذرا پہنو"۔

آشا دھیرے سے بولی۔ "کل پہن لوں گی"۔

بڑھیا خاموش ہو گئی۔ اور لوگ تو پہلے ہی خاموش تھے۔

دن گذرتے جا رہے تھے۔ برسایتں بڑھتی جا رہی تھیں اور آشا کے دل میں جذبات کی آندھیاں تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ پہلے بھی اُداس رہتی تھی مگر اب تو اس کی اُداسی برسنے سے پہلے جھومنے والی گھٹاؤں سے بھی زیادہ سیاہ اور پرہول ہو گئی تھی۔

دیودت۔ پنڈت جی۔ بڑھیا اور آشا کی بہنیں اس کی اُداسی کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مگر ان کے پاس اس کا علاج کوئی نہ تھا۔ ان سب لوگوں پر جب آشا کی اداسی کے گہرے سائے پڑتے تو وہ بھی اُداس ہو جاتے۔ سب سوچ رہی رہے تھے کہ آشا کی زندگی کی خزاں کو کس طرح قابلِ برداشت بنایا جا سکتا ہے کہ ایک دن بازار میں جب یہ لوگ شام کو سیر کرتے جا رہے تھے۔ انہیں ایک جنرل سٹورز کی دکان پر آشا کا خاوند کرپا رام دکھائی پڑ گیا۔ اس کے ساتھ کوئی خوبصورت سی جوان لڑکی تھی۔ پیچھے نوکر کے ہاتھ میں خرید کئے ہوئے سامان کے کچھ پیکٹ تھے۔ کرپارام نے بھی ان لوگوں کو دیکھا اور وہ مسکراتا ہوا اپنے ساتھی کے ہمراہ دوکان سے باہر نکل گیا۔

پنڈت جی کی نگاہوں پر چھائے ہوئے تشکوک چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔ کہ کرپا رام نے دوسری شادی کر لی ہے۔ بڑھیا کی نگاہوں میں لاکھوں ملامتیں رو رہی تھیں کہ کرپارام کسی بدچلن لڑکی کے ہمراہ موسم گرما گذارنے منصوری آیا ہے۔ آشا اور آشا کی بہنوں کے چہرے فق تھے۔ اور دیودت کو جب کرپارام کی موجودگی کا علم کرایا گیا اس نے صلاح دی کہ فوراً ہی کوٹھی واپس چلے جانا چاہیئے۔

سب لوگ واپس گھر آئے۔ پنڈت جی کی چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں اور

آج کے واقعہ نے تو انہیں بالکل ہی اداس کر دیا تھا۔ وہ منصوری کے ذرّے ذرّے سے بے زار ہو اُٹھے۔ اگلے دن ہی وہ سامان باندھنے لگے۔ بڑھیا نے آج تک پنڈت جی کے فیصلہ میں کوئی دخل نہ دیا تھا۔ مگر آشا کی دونوں بہنیں بہت اداس ہو گئی تھیں۔

دیودت نے اصرار کیا۔ "لڑکیوں کو یہیں رہنے دیجئے۔ میدانوں میں ابھی بہت گرمی ہو گی۔ میں تو کہتا ہوں ماتا جی بھی ابھی کچھ روز اور ٹھہریں۔ مگر سوچتا ہوں آپ کو کھانے پینے کی تکلیف ہو گی۔"

دیودت کی پُرخلوص درخواستوں پر پنڈت جی لڑکیوں کو اس کے پاس منصوری میں چھوڑنے پر رضامند ہو گئے۔ اور جس دن وہ آشا۔ لتا اور مالتی کو الوداع کہہ کر منصوری سے روانہ ہوئے۔ آشا کی زندگی کی تمام خزاں ان کی اور ان کی شریکِ حیات کی نگاہوں میں سمٹ آئی تھی۔

مطلع صاف تھا اور موسم خوشگوار ــــــ لتا اور مالتی میٹنی شو دیکھنے گئی ہوئی تھیں ــــــ دیودت اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ اور آشا ڈرائینگ روم میں بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ ــــــ وہ کچھ دن سے موٹی موٹی ناولوں میں اپنے غم کو غرق کر دینے کی کوشش میں محو رہتی اور اسے اس میں قدرے کامیابی بھی حاصل ہو گئی تھی۔ دیودت کا معمول تھا کہ ہر روز دوپہر کو ایک آدھ گھنٹہ کے لئے سو جاتا۔ آشا ناول میں اس قدر الجھ گئی تھی کہ اُسے دیودت کی موجودگی کا اس وقت علم ہوا۔ جب اُس نے کمرے میں آ کر ریڈیو گرام کے گداز نغموں کو ابھار دیا۔ آشا نے کتاب بند کر کے قریب

ہی رکھی ہوئی چھوٹی سی میز پر رکھ دی ۔ اور خود بھی ریڈیو گرام سننے میں محو ہو گئی ۔ ریکارڈ بجتے جاتے تھے اور آشا اپنے جذبات کی دُنیا میں گم ہوتی جا رہی تھی ۔ دو ایک بار دیو دت نے دبی دبی نگاہوں سے آشا کی اس محویت کو دیکھا اور ایک دفعہ جب دفعتاً اُسے محسوس ہوا کہ آشا کے ہونٹوں سے ایک مدھم سی آہ اُبلتے اُبلتے رہ گئی ہے تو وہ اٹھا اور ریڈیو گرام کے سُروں کو بالکل دھیما کر کے پھر صوفہ پر آ بیٹھا ۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ آشا سے بولا " میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں ! "

اُسے آشا کے اس جواب کی قطعی امید نہ تھی " میں بھی آج آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں ! "

دیو دت سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولا " فرمائیے ! "

آشا نے کہا " پہلے آپ کہئیے ۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں ! "

دیو دت بہت سنجیدہ ہو گیا ۔ سامنے دیوار پر لٹکی ہوئی انگلینڈ کے کسی گاؤں کی رنگین تصویر پر اس کی اُلجھی ہوئی نگاہیں جم گئیں ، اور وہ بولا " آپ کے دُکھی جیون کو دیکھ کر میرا اپنا جی بہت دُکھی ہو جاتا ہے ۔ "

آشا کے چہرے پر اُس کے جذبات کا کوئی ردِ عمل نہ تھا ۔ وہ انگلیاں چٹکاتی ہوئی بولی " میں بھی کئی دنوں سے سوچ رہی ہوں ۔ کہ میرا دُکھ آپ کے سُکھی جیون کو دُکھی بنا رہا ہے ۔ مجھے یہاں سے جلد ہی چلے جانا چاہئیے ! "

دیو دت کی سنجیدگی گویا متزلزل سی ہو گئی ۔ وہ یک لخت بول اٹھا " آشا جی ! آپ مجھے بہت غلط سمجھی ہیں ۔ میں اس لئے دُکھی نہیں ہوں کہ آپ یہاں ہیں ۔ مجھے تو اس بات کا دُکھ ہے کہ میں آپ کے کسی کام نہیں آ رہا ہوں ۔ آپ کے چلے جانے

سے تو ہیں یہ سوچ کر اور بھی دکھی ہو جاؤں گا کہ آپ میرے اتنا نزدیک آئیں۔ اور چلی گئیں۔ میں آپ کی کوئی سیوا نہیں کر سکا۔"

آشا کے چہرے پر وہی سنجیدگی تھی جب وہ بولی۔ "میں آپ کے ساتھ آخر کب تک رہ سکتی ہوں۔ دنیا کی لاج تو ایک نہ ایک دن مجھے یہاں سے روانہ کر ہی دے گی۔ اور پھر مجھے معلوم ہے کہ میرے دکھ کو کوئی ہلکا نہیں کر سکتا۔"

دیودت کی آواز بڑی گھمبیر تھی جب اس نے جواب دیا۔ "میرا دنیا کی لاج میں کوئی یقین نہیں ہے۔ دنیا اور دنیا کے اصول چڑھتے سورج کو سلام کرتے ہیں خواہ اس کی کرنیں کتنی ہی مردہ کیوں نہ ہوں اور ڈوبتا سورج لاکھ خوبصورت ہو کون پوچھتا ہے۔"

آشا نے کہا۔ "میں آپ سے ایک سیدھا سا سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔"

دیودت نے کہا۔ "پوچھیے۔"

آشا نے کہا۔ فرض کیجئے میں آپ سے خود التجا کروں کہ آپ میرے دکھ کو ہلکا کر دیجئے۔ پھر آپ کیا کیجئے گا؟"

دیودت سوچ میں پڑ گیا۔ اُسے قطعی اُمید نہ تھی۔ کہ آشا اتنے ذہین دماغ کی مالک ہے۔ اس کی سمجھ دم توڑنے لگی۔ اور وہ راہیں جنہیں وہ سیدھا سادہ سمجھتا تھا۔ ایک دم اُلجھ گئیں۔ وہ لاجواب سا ہوتا ہوا بولا۔ "آپ خود بتائیے کہ میں آپ کے کس کام آسکتا ہوں؟"

آشا نے جواب دیا۔ "اگر مجھے یہ سب کچھ معلوم ہوتا۔ تو دکھ ہی کس بات کا تھا۔ پھر تو راستہ ہی صاف تھا۔ میں اب اپنے سسرال نہیں جا سکتی وہاں مجھے موت کی جوالا نظر آتی ہے۔ میکے میں میں کس دل سے زندہ ہوں۔ جب دیکھتی ہوں کہ میرا

دکھ میرے ماتا پتا کے جیون کو چاٹتا جا رہا ہے۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ آپ کی اس خوبصورت کوٹھی کے باہر مجھے لوگوں کی مشکوک نگاہیں۔ سماج کے گندے طعنے۔ زمانہ کی پھبتیاں اور نہ جانے کیا کیا نظر آتے ہیں۔"

دیودت نے کہا "اگر میں آپ کو یہ صلاح دوں کہ آپ دنیا سے نڈر ہو کر میرے ساتھ رہیں۔ دنیا کچھ کہے مجھ پر کبھی کوئی اثر نہ ہوگا تو آپ کا کیا خیال ہے"؟

آشا بڑی گہری سوچ میں پڑ گئی۔ دیودت کی اس صلاح نے اس کے دماغ میں بہ یک وقت کتنے ہی خدشے کتنے ہی وہم اور کتنی ہی پیچیدگیاں اجاگر کر دیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ گویا اس کے شعور پر چھائی ہوئی گھٹائیں ایک ایک کر کے چھٹنے لگیں۔ وہ بولی۔ "آپ برا تو نہ مانیئے گا"؟

دیودت قدرے پھیکا سا ہوتا ہوا بولا "کہیئے۔"

آشا نے کہا۔ "مجھے کسی بھی مرد پر یقین نہیں رہا ہے۔ اور اسی لئے میں پتا جی کے ساتھ چلی جانا چاہتی تھی۔ مگر نہ جانے کیوں رک گئی۔"

دیودت کافی دیر تک خاموش رہا۔ اور پھر رکتے رکتے بولا "میں خوب سمجھتا ہوں کہ آپ کی جگہ کوئی بڑے سے بڑے دل کی لڑکی بھی ہوتی۔ تو وہ بھی ایسے ہی سوچتی جیسے آپ سوچ رہی ہیں۔ اور میری سمجھ میں یہ نہیں آتا۔ کہ میں آپ کو اپنا یقین کیسے دلاؤں۔ پھر بھی کوئی نہ کوئی راستہ نکالنا ہی ہوگا۔"

آشا کے الفاظ اس کے لبوں پر آئی ہوئی پھیکی سی مسکراہٹ کو ہٹاتے ہوئے ابھرے۔ "راستہ نہ نکل سکے گا۔ میرے پتا جی اپنی شرافت کے لئے بہت مشہور ہیں۔ ابھی میری دو بہنوں کی شادی ہونی ہے۔ میرے یہاں رہنے سے دنیا پتا جی کی شرافت پر بدنامی

کا کفن ڈال دیگی۔ میری بہنوں کا مستقبل تاریک ہو جائے گا ــــــــ راستہ نہ نکل سکیگا" کہتے کہتے آشا بہت اداس ہو گئی۔

دیودت نے کہا "میرے جیتے جی پتا جی کی شرافت پر کوئی بھی انگلی نہ اٹھا سکیگا۔ اور یہ میں دیکھونگا کہ آپ کی بہنوں کی زندگیاں سماج کے ہاتھوں تباہ ہو جائیں"

آشا کچھ سوچتے سوچتے بولی "میں ایک بات اور پوچھنا چاہتی ہوں"

دیودت نے کہا "پوچھئے"

آشا گہری سوچ میں ڈوبتی ہوئی بولی "ہم سب بہنیں پتا جی اور ماتا جی سے سنا کرتی تھیں کہ آپ ہماری ذات کے کوئی دور کے رشتہ دار ہیں۔ آپ نے لڑائی میں بہت روپیہ کمایا ہے۔ آپ کے کارخانے ہیں موٹریں ہیں۔ پھر تین سال ہوئے ہم نے آپ کو دہلی میں دیکھا اور ہمیں محسوس ہوا کہ آپ سچ مچ بہت امیر ہیں" اتنا کہنے کے بعد اس کا لہجہ قدرے تیز ہو گیا "ہم غریب ہیں۔ ہمیں آپ سے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے۔ آپ کو ہم سے ایک دم یہ ہمدردی کیوں پیدا ہو گئی"؟

دیودت پھر گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اس کا چہرہ اتر گیا۔ آشا کے اس سوال کے کئی جواب اس کے لبوں تک آئے اور پھر اپنی کم مائیگی کا احساس کر کے اس کے گلے کو خشک کرتے ہوئے اس کے دل کے کسی گہرے گوشہ میں اتر گئے۔ بالآخر اس نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اس کی بات میں اثر نہیں کہہ ہی دیا "غریب اور امیر کا سوال نہیں ہے۔ سوال ہے انسانیت کا۔ تقدیر نے مجھے امیر بنا دیا یہ ٹھیک ہے مگر بہت کم انسانوں کو معلوم ہے کہ مجھے زمانہ کے ہاتھوں کتنی ٹھوکریں کھانا پڑی ہیں۔ میرے دل پر کیسے کیسے کاری زخم لگے ہیں۔ ان حادثوں نے میرے احساس کو جھنجھوڑ تو ضرور

دیا۔ مگر مجھ میں انسانی ہمدردی پیدا ہو گئی۔ مجھے دہلی میں پتہ چل گیا تھا کہ آپ کے پتا جی دُکھی ہیں۔ اور پھر مجھ سے نہ رہا گیا۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آشا دیودت کی بات سُن ہی نہیں رہی۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ جب وہ گمبھیر آواز میں بولی "جب مجھے سسرال سے دھکا ملا۔ تو میکے میں آتے ہی میں نے دیکھا کہ ہمدردوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ میرے نزدیک آنے والے ہر شخص کی زبان میری مصیبتوں پر ترس کھا رہی تھی ——

مگر —— مگر کہتے کہتے آشا اٹک سی گئی اور پھر گویا اپنے بکھرے ہوئے حوصلوں کو سمیٹتی ہوئی بولی۔ "مگر ایک عورت ہی سمجھ سکتی ہے کہ مرد کی نگاہوں میں جو اس کے لئے ہمدردی پیدا ہو گئی ہے اس میں کتنی شرافت ہے اور کتنا میل ہے۔ مجھے لوگوں سے دامن بچانا مشکل ہو گیا۔"

دیودت آشا کی بات میں بول اُٹھا۔ "آپ مجھے نہیں لوگوں میں سمجھتی ہیں کیا؟"

آشا نے کہا۔ "میں آپ کو کچھ بھی نہیں سمجھ سکی ہوں۔ میں اپنی دُنیا کے انسانوں کو سمجھ سکتی ہوں۔ موٹروں۔ کوٹھیوں اور سونے چاندی کی دُنیا میں رہنے والے انسانوں کو نہیں سمجھ سکتی ہوں۔ میں اس دُنیا میں کبھی آئی ہی نہیں۔ اس تجربہ کی قیمت چکانے کے لئے میرے پاس اب پونجی ہی نہیں۔"

دیودت نے آنکھیں بھینچتے ہوئے کہا۔ "اگر میں یہ کوٹھیاں۔ یہ موٹریں۔ یہ سونا چاندی کی دُنیا چھوڑ دوں پھر تو آپ کو مجھ پر کوئی شک نہ ہوگا۔ میں انسانیت کے لئے کسی بھی حد تک جانے کے لئے تیار ہوں۔"

آشا سوچ میں پڑ گئی۔ اور کچھ نہ بول سکی۔ دیودت آشا کی خاموشی سے اکتاتے

ہوئے بولا "کیا آپ کو میری سیوا منظور نہیں"؟

آشا اپنی ادھیڑ بُن کے پھندوں سے لمحہ بھر کے لئے ابھرتی ہوئی بولی۔ "مجھے سوچنے کا موقعہ دیجئے۔"

دیو دت اٹھتا ہوا بولا۔ "اچھی طرح سوچ لیجئے۔" اور اتنا کہہ کر اس نے ریڈیو گرام کے سُروں کو پھر اُبھار دیا۔

آٹھ دس روز بعد جب لتا اور مالتی اپنے پتا جی کے پاس جا چکی تھیں اور آشا کو دیو دت کے پُر خلوص اصرار نے کچھ دن کے لئے اور ٹھہر نے پر مجبور کر دیا تھا۔ دیو دت نے آشا کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اب تو آپ نے سوچ لیا ہوگا؟"

آشا نے حسب معمول سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے سوچا —— بہت سوچا اور میں نے پتا جی اور ماتا جی سے بھی پرارتھنا کی کہ وہ بھی سوچیں۔"

دیو دت متعجب سا ہوتا ہوا بولا۔ "میں سمجھا نہیں۔"

آشا نے نہایت سادگی سے کہا۔ "اُس دن میری اور آپ کی جو باتیں ہوئی تھیں میں نے وہ سب پتا جی کو لکھ دی تھیں۔"

دیو دت نے کچھ پریشان سا ہوتے ہوئے پُوچھا۔ "کیا جواب دیا انہوں نے"؟

آشا نے کہا۔ "انہوں نے وہی جواب دیا جو ایک اچھے ماتا پتا دیتے ہیں۔ پتا جی نے لکھا ہے کہ میں جس طرح چاہوں اپنی زندگی کو خوشگوار بنا سکتی ہوں انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر جو بھی قدم اٹھاؤں سوچ سمجھ کر اٹھاؤں۔"

دیو دت کے چہرے سے پریشانی کے نقوش ایک ایک کر کے مٹ گئے وہ بولا۔ "تو آپ کو پتا جی نے یہاں رہنے کی اجازت دے دی؟ آپ نے کیا سوچا ہے"؟

آشا نے اعتراف کیا۔ "میرا دماغ اتنا الجھ گیا ہے کہ مجھے کچھ سوجھتا ہی نہیں"۔

دیودت نے متانت سے کہا۔ "اب آپ سوچنا بند کر دیجئے۔ اور مجھ پر یقین رکھیئے۔ میں آپ کی امیدوں کو کبھی ٹھیس نہ لگنے دونگا۔ آپ کے دل کو میری طرف سے کبھی کوئی چوٹ نہیں لگے گی"۔

آشا دیودت کو کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھنے لگی جو خاموش ہونے کے باوجود غمازی کر رہی تھیں۔ کہ تمہارے کہنے پر میں ایک نہ جانی پہچانی خندق میں چھلانگ لگا دونگی یہ تم دیکھنا کہ میرے ارمانوں کو چوٹ نہ لگے۔

آشا دیودت کے ساتھ دہلی پہنچ گئی۔ اور ایک ایک کر کے کئی مہینے گذر گئے۔ گھر کے نوکر چاکر آشا کو گھر کی مالکن سمجھنے لگ پڑے تھے۔ اوّل اوّل۔ ان کی نگاہوں میں شکوک کی جو مدھم پرچھائیاں تیرتی رہتی تھیں۔ اب یقین کے ہاتھوں پختہ ہو کر ان کے دلوں کی گہرائیوں میں اتر چکی تھیں۔

آشا جیسے جیسے دیودت کے نزدیک آتی گئی۔ وہ اس کی شخصیت سے مرعوب ہوتی چلی گئی۔ اتنا بڑا دھن وان ہونے کے باوجود وہ سگریٹ تک نہیں پیتا تھا۔ اس کو شراب کے نام سے چڑ تھی۔ سینما بھی وہ بہت کم دیکھنے جاتا تھا ـــــــ وہ صفائی پسند تھا۔ اس کا مذاق سلجھا ہوا تھا۔ وہ بہت جلد رات کو سو جاتا۔ اور صبح سویرے بہت جلد جاگ اٹھتا۔ رات کو وہ کوئی نہ کوئی کتاب پڑھے بنا سو ہی نہیں سکتا تھا۔ مطالعہ اس کی روز کی زندگی کی ضروریات میں سے ایک اہم ضرورت بن گیا تھا۔ علاوہ اس کے کتنا بڑا کارخانہ تھا اس کے پاس۔ آٹھ سو مزدور اس کے

ہاتھوں کی طرف دیکھتے تھے۔ وہ کام دیکھنے کبھی کبھار ہی جاتا مگر اتنی دہشت تھی اس کی کہ جب بھی وہ کارخانہ میں جاتا پھاٹک کے چپڑاسی سے لے کر جنرل منیجر تک کا دم خشک ہو جاتا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا۔ کہ اگر ایک بار بھی کوئی اس کے غصے کا شکار ہو جاتا تو پھر کوئی منت کوئی سماجت کوئی خوشامد دیودت کے دماغ کو اعتدال پر نہیں لا سکتی تھی۔ کاروبار میں بھی اس کے فیصلے فوری ہوتے اور ایک دفعہ جو فیصلہ ہو جاتا وہ اٹل ہوتا۔

اس کے کھانے کی میز پر روزانہ درجنوں آدمی اکٹھے ہوتے۔ ان میں بڑے بڑے سرکاری اہلکار۔ ٹھیکیدار۔ جنتا کے حقوق کے دعویدار اور ایسی ہی اہم شخصیتیں ہوتیں، جن کی "مدد" اس کے کارخانہ کی ترقی کے لیئے ضروری تھی۔ زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ آشا نے خود کو اسی ماحول کے سانچے میں ڈھال لیا تھا اور اب اس کے لبوں کی لطیف سی مسکراہٹ ان "مددگار"، "بارسوخ" ملاقاتیوں کو دیودت کی حمایت اور رفاقت کے لیئے اور بھی مجبور کر دیتی۔

اس دن دیودت اور آشا سینما کا دوپہر کا شو دیکھ کر واپس آ رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ کوٹھی کے پھاٹک پر مزدوروں کا ہجوم ہے۔ موٹر رک گئی۔ دیودت کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آشا سہم گئی۔

دیودت کڑکا۔ "موٹر کیوں روکی گئی ہے؟"

مزدوروں کے ایک رہنما نے مطالبات پیش کیئے۔

دیودت اور بھی آگ بھبھوکا ہو گیا۔ وہ چلایا۔ "مزدوروں کے مطالبات کسی دباؤ یا دھونس سے پورے نہیں کیئے جا سکتے۔"

بجھی بجھی نگاہیں ویران ویران پلکوں میں سے اُبھر کر ایک دوسرے کی طرف اٹھ گئیں۔ پھٹی ہوئی بوسیدہ قمیصوں اور تار تار دامنوں والے انسانوں کے اس چھوٹے سے مجمع کے نصف مفلوج دماغ میں بس ایک ہی سوال تیر اُٹھا۔ "کیا واقعی وہ کوئی ناجائز دباؤ ڈال رہے ہیں۔ کیا سچ مچ وہ اپنے بڑے صاحب کو دھونس دے رہے ہیں" اور پھر ملتجی ملتجی سی نگاہیں اپنے رہ نما کی طرف اُٹھیں۔

رہ نما نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "حضور ہم اپنی شکایت ڈیڑھ سال سے منیجر صاحب کو سُنا رہے ہیں۔ مگر انہوں نے کوئی دھیان ہی نہیں دیا۔"

دیودت نے کہا۔ "میرے پاس کوئی شکایت نہیں آئی ہے۔"

رہنما کے دماغ میں اس کے ساتھیوں کی بھوک بلبلا اٹھی اور وہ بولا۔ "تو اس میں ہمارا قصور نہیں ہے۔ غریب پرور! ہم بہت چیخے مگر ہماری آواز کارخانہ کی چہار دیواری سے نکل کر آپ کی کوٹھی تک نہ پہنچ سکی۔ ہمارے پاس اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا کہ ہم اب آپ کو اپنا دکھ درد خود ہی سُنائیں۔"

دیودت کا غصہ گویا لمحات ہی میں کافور ہو گیا۔ وہ بہت سنجیدہ ہو کر بولا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تمہاری آواز مجھ تک نہ پہنچ سکی۔ کل گیارہ بجے دن کو تم لوگ میری کوٹھی میں آنا۔ وہاں سب فیصلہ ہو جائیگا۔"

مُرجھائے ہوئے چہرے کھل اُٹھے۔ دیودت زندہ باد کے نعروں سے فضا گونج اٹھی اور آشا کی نگاہوں میں دیودت کے لئے ایک بے پناہ عقیدت کا طوفان امڈ آیا۔

ڈرائینگ روم میں پہنچتے ہی دیودت نے نوکر کو حکم دیا کہ منیجر صاحب کو

حاضر کیا جائے۔ آشا کا جی چاہتا تھا کہ دیودت کے قدم چوم لے۔

کچھ دیر بعد ایک گول میز کے چاروں طرف آشا۔ دیودت اور مینیجر صاحب بیٹھے تھے۔

دیودت نے پوچھا۔"تمہارے مزدور تو سچ مچ حد سے آگے گذر گئے ہیں"۔

مینیجر نے جبڑے سمیٹتے ہوئے جواب دیا۔"میں تو آپ سے ایک برس سے عرض کر رہا ہوں"

آشا کو دیواریں ہلتی سی نظر آئیں۔

دیودت نے سنجیدگی سے پوچھا۔"ان کے رہنما کون کون سے ہیں"؟

مینیجر نے کہا۔"جوتی۔ راموں شنتیل اور بنواری"۔

دیودت میز پر رکھی ہوئی پنسل اٹھا کر اپنا ماتھا ٹھونکنے لگا۔ آشا اور مینیجر سمجھ گئے۔ کہ دیودت کسی اہم فیصلے پر پہنچ رہا ہے۔ ایسی حرکت وہ ایسے ہی موقعوں پر کیا کرتا تھا۔ دیودت نے حسب معمول سنجیدگی سے پوچھا۔"کیا مطالبات ہیں ان کے"؟

مینیجر نے جواب دیا۔"یہ لوگ کارخانہ میں ہسپتال چاہتے ہیں۔ مہنگائی الاؤنس اور مزدوری میں اضافہ مانگتے ہیں"۔

دیودت نے کہا۔"کل کو ان کی ہسپتال کی مانگ منظور ہوگی۔ مہنگائی الاؤنس بھی کچھ دینگے۔ مزدوری بھی بڑھانی ہوگی"۔

مینیجر نے خیر خواہی جتاتے ہوئے کہا۔"یہ لوگ سر پر چڑھ جائیں گے حضور۔ ان کو اتنی ہی روٹی دیجیئے کہ مزید بھوک مٹانے کے لیئے یہ لوگ آپ کے ہاتھوں کی طرف

دیکھتے رہیں"!

دیودت بول اُٹھا "تم نہیں سمجھتے ہو۔ ہسپتال کی عمارت کا خرچ انکم ٹیکس سے کٹ جائیگا"! اور ہاں ان کے رہنماؤں پر نظر رکھو۔ دو مہینہ کے اندر اندر انہیں کسی نہ کسی بہانہ سے کارخانہ سے نکال دو۔ اپنے رہنما کھڑے کرو۔"

مینجر کے چہرے کا ایک ایک نقش دیودت کی دور اندیشی کی داد دے رہا تھا۔ اور آشا کی نگاہیں۔ اس کا شعور۔ اس شعور میں پنپنے والے سینکڑوں ارمان۔ وسوسوں کے پھندوں میں الجھ کر رہ گئے۔ وہ اس کمرے سے اُٹھ کر برآمدے میں آ بیٹھی۔ کچھ دور پر کارخانہ کی چمنی سے دھوئیں کے گچھے کے گچھے اُبل رہے تھے۔ اس کا تصور کراہ کراہ کر کہنے لگا کہ نہ جانے اس دھوئیں میں کتنی آہیں اور ان آہوں کے کتنے مطالبات ابل چکے ہونگے۔ وہ سب ایک ایک کرکے اپنا وجود خنک فضا کے کھوکھلے جبڑے میں کھو چکے ہیں۔ اُسے اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ جیسے جیسے شام کے سرمئی سائے بڑھتے جارہے تھے۔ اس کی اپنی زندگی کی گتھیاں الجھتی جارہی تھیں۔ اسے دیودت سے ڈر آنے لگا۔ آج پہلی بار اُسے اس کی سنجیدگی کی تہوں میں پیچ دار جالے دکھائی پڑنے لگے۔ وہ کھوئی کھوئی سی نہ جانے اور کب تک وہاں بیٹھی رہتی اگر دیودت اُسے چائے پینے کے لئے آواز نہ دیتا۔ چائے کی میز پر بھی وہ اپنے شکوک اور توہمات کے تانے بانے ہی بنتی رہی۔ دیودت اس کی سنجیدہ حالت پر کبھی کبھی غور کرکے پھر چائے کی چسکیاں لینے لگتا اور اس کی اُس اداسی کو تکان سے منسوب کرکے اپنے دل میں سر اٹھانے والے خدشات کی زبان بند کر دیتا۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد جب دیودت اور آشا حسب معمول ڈرائنگ روم

میں بیٹھے تھے۔ دیودت کے توہمات یقین کا لبادہ اوڑھنے لگے۔ اس نے ایک تنکے سے دانت صاف کرتے ہوئے بات چھیڑی۔ "آج پکچر اچھی تھی۔"

آشا نے مریل سی مسکراہٹ کو اپنے لبوں پر سمیٹتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں اچھی تھی"۔

دیودت نے پکچر پر مزید کوئی تبصرہ کئے بغیر پوچھا "آج بات کیا ہے"؟

آشا نے بات کاٹتے ہوئے جواب دیا "کوئی خاص بات نہیں"۔

دیودت نے اصرار کیا۔ "پھر بھی"؟

اس بار آشا قدرے کھلی اور بولی۔ "میری طبیعت بہت اداس ہے۔ کتنے ہی دنوں سے پتاجی کا کوئی خط نہیں آیا"۔

دیودت نے کہا۔ "ابھی تار دے کر خیریت کا پتہ منگوا لیتے ہیں"۔

آشا نے کہا۔ "نہیں! مجھے گھر سے آتے ہوئے بھی کئی مہینے گذر چکے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کل گھر چلی جاؤں"۔

دیودت نے تنکا پھینکتے ہوئے کہا۔ "دوسہرہ میں کل ڈیڑھ مہینہ ہے۔ میں بھی چلونگا"۔

آشا نے پھر اصرار کیا۔ "آپ دوسہرہ پر آجائیے گا۔ مجھے کل جانے دیجئے"۔

دیودت نے کہا۔ "کیا سچ مچ طبیعت اتنی اداس ہو گئی ہے"؟

آشا نے جواب دیا۔ "سچ مچ"۔

دیودت نے کہا۔ "تو ریل کی بجائے کار لے جانا۔ میں شاید دوسہرہ سے پہلے ہی آجاؤں"۔

اُس رات آشا جلد ہی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

آشا کے گھر پہنچتے ہی گویا کُنبہ کا کُنبہ کِھل اُٹھا تھا۔ ماں کی ممتا بہنوں کا پیار اور پتا کا لاڈ امڈا امڈا پڑ رہا تھا ـــــ مگر آشا نے پانچ دس روز بعد ہی محسوس کیا کہ اس کی ماں کے لبوں پر، اور اُس کے پتا کی آنکھوں میں اس کے مستقبل کے لئے بے یقینی اور وحشت کی پرچھائیاں پھیلی پھیلی جاتی ہیں۔ آشا سب کچھ سمجھتی تھی مگر چُپ تھی۔ وہ جانتی تھی۔ کہ جس وسیع خلا میں اس نے بلندیوں سے چھلانگ لگائی تھی اس میں وہ اپنے والدین کی رضا تو کسی نہ کسی حد تک شامل کر سکی تھی۔ مگر وہ ان کے خدشات مٹانے میں قطعی کامیاب نہ ہو سکی تھی۔

دوسہرہ سے بہت پہلے دیودت آ پہنچا۔ اس کی خاطر تواضع میں کوئی کمی نہ اُٹھا رکھی گئی۔ اور ایک رات جب اُسی پُرانے کمرے میں وہ پنڈت جی اور ان کی شریکِ حیات کھانا کھانے کے بعد بیٹھے ہوئے ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔

دیودت نے کہا۔ "میں کل جاؤنگا۔"

بُڑھیا نے تکلف برتا۔ "ابھی دو دِن تو آئے ہوئے نہیں ہوتے جانے کی بھی پڑ گئی ہے۔"

دیودت نے کہا۔ "کاروبار کا خیال ہے اور مجھے یہاں آتے ہوتے بھی تو کتنے ہی دن ہو گئے ہیں" ۔ اور پھر وہ اٹکتا اٹکتا ہوا بولا۔ "آشا کو بھی تیار کر دیجیئے گا۔"

بڑھیا پنڈت جی کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

پنڈت جی حقّہ کا کش لیتے ہوئے بولے۔ "کافی روز تو آشا آپ کے پاس رہ

آتی ہے۔"

اپنی تمام جرأتوں کو سمیٹتا ہوا دیودت بولا۔ "پتاجی! میں تو سمجھتا ہوں اب آشا تمام جیون میرے ساتھ ہی رہے گی۔"

پنڈت جی کی نگاہیں حقہ کی چلم پر جم گئیں اور ان کے کش دھیمے مگر لمبے ہو گئے۔ دیودت کو یہ اندازہ لگانے میں کچھ بھی وقت نہ لگا کہ آج پنڈت جی آشا کے بارے میں دوٹوک فیصلہ کرنے پر آمادہ ہو چکے ہیں۔ اُس کے ناخن گاؤ تکیہ پر چل رہے تھے مگر وہ ہمہ تن آغوش پنڈت جی کے لبوں سے اُبھرنے والے الفاظ کو سنبھالنے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ اس کے ماتھے کی شکنیں گویا ہر اٹھنے والے اعتراض کا مقابلہ کرنے کے لئے لہرا اٹھی تھیں۔

پنڈت جی نے کہا۔ "آپ کے دل میں آشا کے دکھ نے گھر کر لیا ہے۔ مگر دیودت جی زمانہ بہت نازک ہے۔"

دیودت نے کہا۔ "یہ میں سمجھتا ہوں پتاجی"!

پنڈت جی بولے۔ "مجھے زمانہ کی اتنی پرواہ بھی نہیں۔ آشا آپ کے ہاں سات مہینے رہی۔ آپ نے اُسے کافی دم دلاسہ دیا ہے۔"

دیودت چاہتا تھا کہ جو کچھ بھی اس کے دل میں ہے یک لخت بیان کر دے۔ مگر وہ بہت حوصلہ کرنے کے باوجود بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ بڑھیا اور پنڈت جی کے منہ کی طرف دیکھ کر خاموش ہو رہا۔

پنڈت جی بولے۔ "ہزاروں برسوں سے ہمارے سماج نے عورت کی گردن میں وہ زنجیریں ڈال رکھی ہیں جن کے بوجھ تلے عورت کی آزادی تو کیا آزادی

کا خیال تک بھی کبھی کا دم توڑ چکا ہے اور اب عورت اپنی غلامی ہی کو اپنے چرتر کی شان سمجھنے لگ پڑی ہے۔ مان مریادا۔ دھرم اور روائیتیں من گھڑنت کہانیاں غرضیکہ نہ جانے کتنی زہریلی ناگنوں سے سماج کے ٹھیکیداروں نے عورت کے دماغ کو ڈسوا ڈسوا کر ناکارہ کیا ہے۔ آج اگر کوئی اُسے ان بندھنوں سے چھڑانا بھی چاہتا ہے۔ تو اوّل تو پنچھی خود ہی پنجرا چھوڑنا نہیں چاہتا اور اگر پنجرے کے باہر کی دُنیا کا تصوّر اس کے پروں میں اڑان کی خواہش بھرتا بھی ہے۔ تو شاستروں کے لاکھوں حوالے اور ان حوالوں کو طوطے کی طرح رٹنے والے لاکھوں ٹھیکیدار پھن پھیلا کر کھڑے ہوتے ہیں۔"

اس بار دیودت بولا۔ "پتا جی! آپ کا آشیرباد چاہیئے۔ ان کالے ناگوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے!"

پنڈت جی حقّہ کی نے ہٹاتے ہوئے بولے۔ "مجھ اکیلے کے آشیرباد سے کچھ نہ بنے گا دیودت جی! لاکھوں برسوں سے ہم نے ظلم کو پنپنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ ہم مردوں نے اپنے تو جملہ حقوق محفوظ کر لئے۔ مگر عورت کا آنکھ اٹھانا بھی صدیوں سے جرم قرار دے رکھا ہے۔ اب اس کا خمیازہ ہماری اپنی بیٹیوں کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ جو زہر کا بیج کبھی ہم نے بویا تھا اب وُہ پھوٹ کر اتنا بڑا درخت بن چکا ہے جسے میرے کھوکھلے آشیرباد نہ پھونک سکیں گے۔"

دیودت نے فیصلہ دیتے ہوئے کہا۔ "مگر میں آشا کی زندگی تباہ نہ ہونے دُونگا۔"
پنڈت جی نے سیدھا سا سوال پُوچھا۔ "کیا کریں گے آپ؟"

بڑھیا بھی دیودت کے مُنہ کی طرف دیکھنے لگ پڑی ـــــ دیودت نے کہنا تو بہت کچھ تھا۔ مگر وُہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

پنڈت جی پھر بولے "۔ آشا اپنی آگ میں جل کر مر جائے گی۔ کوئی بھی کچھ نہ کر سکیگا۔ اس کی چِتا سے اُٹھتی ہوئی چنگاریاں ہمیں بھی بھسم کر دینگی اور سماج کے قہقہے ایک لمحے کے لئے بھی مدھم نہ پڑیں گے"۔

دیودت کے جذبات بہت دیر سے اندر ہی اندر گھُٹ رہے تھے اور وُہ خود اپنے اُوپر جھُنجلا رہا تھا۔ اُس نے رُکتے رُکتے کہا۔ "ایک بہت بے ادبی کی بات کہنا چاہتا ہُوں"۔

پنڈت جی نے آنکھیں بھینچتے ہوئے کہا۔ "کہیئے۔ بالکل نڈر ہو کر کہیئے"۔

بالآخر دیودت کہہ ہی گیا۔ "مَیں آشا سے شادی کرنے کو تیار ہُوں"۔

پنڈت جی کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بےچین سے ہو کر بولے۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ گو مَیں چاہتا ہوں کہ اَیسا ہو جائے۔ آشا کی ماں کو بھی اس میں کوئی اعتراض نہیں۔ مگر یہ ہو کیسے سکتا ہے"؟

دیودت نے کہا "کیوں نہیں ہو سکتا۔ جب آپ کو اعتراض نہیں تو سب کچھ ہو سکتا ہے"۔

پنڈت جی بولے۔ "جب تک آشا نامرادی کی آگ میں جل رہی ہے۔ اُس کر پارام کو کوئی اعتراض نہیں۔ مگر جس وقت وہ دیکھے گا کہ آشا کے جیون سے خزاں اُڑنے لگی ہے۔ اس کی خودداری اور اس کا مردانہ پن ایک دم جاگ اُٹھینگے۔ اور پھر آپ کی اور آشا کی عزت کی خاک کچہریوں کی بھنبھناتی ہوئی دُنیا میں اُڑاتی

جائے گی۔"

دیو دت نے سوچتے سوچتے کہا۔ "ہندو کوڈ بل بہت جلد پاس ہونے والا ہے پتا جی!"

پنڈت جی بولے۔ "مجھے امید نہیں کہ یہ بل اتنی آسانی سے پاس ہو۔ عورت کو مرد کی غلامی سے نجات دلانے والے جانتے ہیں کہ وہ اپنے مرد بھائیوں کے بل بوتے ہی پر حکومت کے سرپنچ بن کر آئے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ اگر انہوں نے کوئی ایسی غلطی کی۔ جو مردوں کی اکثریت کے وقار کو دھکا لگا سکتی ہے تو پھر وہ آسانی سے حکومت کے سرپنچ نہ بن سکیں گے۔ کون اتنا ننا گی ہے جو اپنا ناش کر کے دوسروں کا بھلا کرنے گھر سے نکلے گا۔ اوّل تو مجھے یہ یقین ہے۔ کہ یہ بل پاس ہی نہیں ہو گا۔ اور اگر ہو بھی گیا تو ایسی شکل لے کر پاس ہو گا۔ کہ عورت جہاں ہے وہیں رہ جائے۔ اور بل پاس کرنے والوں کے جے کاروں سے آسمان بھی گونج اُٹھے۔"

دیو دت بولا۔ "آشا کی مصیبتوں نے آپ کو بہت یاس پسند بنا دیا ہے۔"

پنڈت جی بولے۔ "یاس پسندی نہیں ہے دیو دت جی —— یہ کڑوی حقیقت ہے۔ میں نے زندگی میں کبھی جھوٹے خواب نہیں دیکھے ہیں۔ میں غریب ہوں اور کون غریب ایسا ہے جسے سنہری سپنے رچنے کی فرصت ہو۔"

بڑھیا بیچ میں بول اُٹھی۔ "تم بیٹا آشا سے شادی تو کر لو گے مگر تمہاری پہلی استری کا کیا بنے گا؟"

دیو دت نے کہا۔ "وہ میری طرف سے آزاد ہے۔ اگر مجھے دوسری شادی

کرنے کا حق ہے ۔ تو وہ بھی دوسری شادی کر سکتی ہے ۔"

پنڈت جی لگا ہوں میں دیودت کے لئے گویا عقیدت اور محبت کی گنگا اُبل پڑی ۔ وہ بولے "کاش آپ جیسے کچھ لوگ اور بھی ہوتے ۔"

دیودت کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس نے سر جھکا لیا ۔

پنڈت جی بولے "میں اپنی بیٹی کے لئے زندگی کی ہر بازی لگانے کے لئے تیار ہوں ۔ اگر آپ اُسے اس کا لٹا ہوا سکھ دے سکتے ہیں تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے ۔"

بڑھیا نے سہارا دیا "اور دُنیا تو کبھی خوش ہوتی ہی نہیں ۔ ہم دُنیا کے ڈر سے بیٹی کی زندگی نہیں بگاڑ کر بیٹھ جائیں گے ۔"

دروازے کے ساتھ لگی ہوئی آشا کو زندگی کی گتھیاں سلجھتی ہوئی نظر آنے لگیں ۔

آشا نے کتاب سرہانے رکھی ہوئی میز پر رکھ دی اور آنکھیں بند کر کے بستر پر لیٹ گئی ۔ وہ پڑھتے پڑھتے تھک گئی تھی ۔ کوٹھی کی آسائش اور رہائش اب اس کے لئے کوئی معنی نہ رکھتی تھی ۔ تین برس ہو گئے تھے اُسے اس امیرانہ ماحول میں رہتے رہتے ۔ قالینوں ۔ صوفہ سیٹوں اور ریڈیو گرام کے سُریلے نغموں کی اس دُنیا میں وہ جاذبیت نہ رہی تھی ۔ تین سال کا یہ زمانہ ہنستے یا روتے کسی نہ کسی طرح گذر ہی گیا تھا ۔ اس وقت کی تقسیم کرتے ، باریک

باریک اوراق پر ہو چکی تھی۔ اور ان اوراق پر کتنے واقعات نہ کتنے حادثات۔ کتنی تلخیاں۔ کتنی شیر بنیاں نچھی ہوئی تھیں۔ ماضی کی ضخیم کتاب کے اوراق اس کی نگاہوں کے سامنے اس کے شعور نے چند لمحات ہی میں پلٹ کر رکھ دئے۔

اس کے پتاجی کو فالج ہوا۔ ان کی نوکری چھوٹ گئی۔ شہر کی میونسپلٹی خود بہت مفلس تھی انہیں پنشن کیا دیتی۔ دیودت نے پانچ ہزار روپیہ کا چیک اگر نہ بھیجا تو شاید اُس کے ماں باپ بھوکوں مر جاتے۔ اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔

اس کے پتی کرپارام نے دیودت کے ساتھ اس کی رہائش پر اعتراضات بلند کئے۔ وہ کچہری بھی گیا۔ اس پر بدچلنی کے الزامات لگائے گئے۔ زمانہ نے وہ وہ نمک پاشیاں کیں کہ توبہ بھلی۔ یہی نہیں دیودت کی پہلی بیوی نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ اس کے میکے والوں نے ایک طوفان برپا کر دیا۔ مگر دیودت پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اور وُہ بھی خود ایک اُس لرزتی ہوئی کمزور سی چٹان کی مانند زمانہ کے تھپیڑوں کو اب تک کھاتی چلی جا رہی تھی جس پر ہر لمحہ سمندر کی لہریں یلغاریں کرتی رہتی ہیں۔ اور دیکھنے والوں کو ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ وہ چٹان اب بھی غرقِ آب ہوئی۔ اب بھی لہروں کی طغیانی اُسے اپنے ساتھ بہا لے گئی۔ اب بھی سمندر کے کنارے پانی نے اس کی جڑیں کھوکھلی کر کے اسے موجوں کے جھاگ آلود جبڑے میں جھونک دیا۔ مگر زندہ رہنے کی خواہش اسے اتنے وسوسوں۔ خدشوں اور کشمکشوں کے جمگھٹوں میں گھر جانے پر بھی موت سے دُور دوڑا رہی تھی۔

وقت کی اتنی آہنی آزمائشوں سے گذرنے کے بعد بھی اس کے پاؤں

زمین کے ساتھ نہیں لگتے تھے۔ ـــــــ بلکہ کبھی کبھی تو حوادث کی لہریں اتنی تیز ہو جاتی تھیں کہ اُسے یقین ہونے لگتا تھا کہ اب وہ کسی طرح بھی زمانے کی چیرہ دستیوں کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔ اس کے پاؤں اکھڑ چکے ہیں۔ گردشِ روزگار کے بھنور میں اس کی ہڈیوں تک کا پتہ نہ چلے گا۔ اور پھر وہ کانپ کانپ اٹھتی۔ اگر دیونت کوٹھی میں موجود ہوتا تو وہ اس کے پاس آ بیٹھتی۔ اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگتی اور جب دیونت اس سے اس کی پریشانی کی وجہ دریافت کرتا۔ تو وہ اپنی جراتوں کی شکست کو اپنی مسکراہٹ میں چھپا لیتی۔

آج دیونت کاروبار کے کسی سلسلہ میں غازی آباد گیا ہوا تھا اور آشا اپنی تنہائیوں سے ہراساں ہو کر خدشات کے ڈر اور نے جبڑوں میں گھری ہوئی نیم مردہ سی ہوتی جا رہی تھی

پھاٹک کھلنے کی آواز آئی۔ اور پھر کار سائبان کے سامنے رک گئی۔ آشا کی ہمت سی بندھ گئی۔ دیونت آ گیا تھا ـــــــ وہ اپنے پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

دیونت نے کمرے میں آتے ہوئے پوچھا۔ "طبیعت ٹھیک ہے"؟

آشا نے اپنی ذہنی آلائشوں کو اپنی مسکراہٹ میں چھپا لیا

دیونت تبدیلیِ لباس کے لئے اپنے کمرے میں جانے لگا۔ تو آشا نے گلہ کیا۔ "آج آپ نے بہت دیر لگا دی"؟

دیونت نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "کہاں دیر لگا دی۔ وقت

سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے تو آ گیا ہوں"؟

آشا کے ابریشمی لبوں پر پھر اُداس سی مُسکراہٹ چھا گئی۔ دیودت اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور آشا سوچنے لگی۔ "کتنے اچھے ہیں یہ۔ انہوں نے میرے لئے زمانہ سے کتنا لوہا لیا۔ یہ اب تک مجھ سے شادی نہیں کر سکے ہیں تو اس میں ان کا کیا قصور ہے۔ ابھی تک ہندو کوڈ بل ہی پاس نہیں ہوا۔ قانون نے خود ان کے ہاتھ جکڑ رکھے ہیں ——— مگر ان میں یہ تبدیلی سی کیا آ رہی ہے"؟

کچھ ہی دیر بعد دیودت اور وہ برآمدے میں بیٹھے تھے ——— ہوا کی نازک خرامی سبزہ کی زلفوں کو تھپکیاں دے رہی تھی۔ لان کے چاروں طرف سُرخ و سفید پھول لہرا رہے تھے۔ اور دُور افق کی نیلی چلمنوں کے پیچھے سُورج کو چھپے کچھ ہی لمحات گذرے تھے

آشا نے محسوس کیا کہ دیودت آج خلاف معمول سنجیدہ ہے۔ آشا اپنی اُدھیڑ بُن کو بھول گئی۔ وہ بولی "آج آپ اُداس نظر آتے ہیں"؟

دیودت "ہوں" کہہ کر خاموش ہو گیا

آشا نے پُوچھا۔ "پینے کے لئے کوئی ٹھنڈی چیز منگواؤں"؟

دیودت نے اُسی لہجے میں کہا۔ "نہیں"۔

آشا نے پھر اصرار کیا۔ "بات کیا ہے"؟

دیودت اس بار بولا۔ "بہت سی باتیں ہیں۔ بہت کچھ کہنا چاہتا ہُوں مگر نہ جانے تم سُن بھی سکو گی یا نہیں"۔

آشا کچھ پریشان سی ہو اٹھی ۔ دیو دت نے اس سے ایسی باتیں کبھی نہیں کی تھیں ۔ وہ کڑوا سا گھونٹ بھرتے ہوئے بولی "کہئیے"!

دیو دت نے اس کی شکل کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا "تمہارے کانوں میں یہ موتیوں کے آویزے بہت حسین معلوم ہوتے ہیں ۔ تم خود بھی بہت حسین ہو ۔ اور ان آویزوں کے پہننے کے بعد تم بالکل ملکہ معلوم ہوتی ہو"

آشا شرما سی گئی ۔ مگر اس کے خدشات بالکل نہ شرمائے اور وہ بولی "آپ بات ٹال گئے ہیں"!

دیو دت بولا "میری باتوں کو چھوڑو ۔ مجھے تو کبھی کبھی دورہ پڑا کرتا ہے"!

آشا نے بڑے خلوص سے اصرار کیا "بتائیے نا کیا بات ہے"؟

دیو دت سنجیدہ ہو گیا ۔ وہ بولا "ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تین برس گذر چکے ہیں ۔ مگر آشا! تمہیں میرے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے"!

آشا کھوکھلی کھوکھلی نگاہوں سے دیو دت کی طرف دیکھنے لگی

دیو دت نے کہا "لڑائی کے دنوں میں یہ موٹا کھدر پہننے سے پہلے میں شراب پیا کرتا تھا"

آشا خاموش رہی ۔

دیو دت نے کہا "اور اب میری روح کسی دباؤ تلے مری جا رہی ہے ۔۔

ہیں یہ بہروپ کتنے دن تک بھرتا رہونگا۔ مجھے کھدّر پر قطعی یقین نہیں ہے میں اپنے اصلی رُوپ میں زندہ رہنا چاہتا ہُوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان بجھی بجھی شاموں کے بے کیف خانوں میں شراب کے چھینٹوں سے سُرخ رنگ بھر دُوں۔ کھنکھتی ہوئی راتوں کو اور کھنکا دُوں۔ مَیں تو دِق آگیا ہوں اِس سنیاسی دُنیا سے؟"

آشا نے کہا "تو آپ کو روکتا کون ہے"؟

دیودت کا چھوٹا سا جواب تھا "زمانہ کی مصلحتیں"۔ اور پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اُس نے پُوچھا "تم میرا ساتھ دے سکو گی"؟

آشا کا چہرہ زرد پڑنے لگا۔ ایسی ہی باتوں سے کبھی کرپا رام نے اس کی سہاگ رات کو بے کیف بنا دیا تھا۔

دیودت نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پُوچھا "ڈر گئیں کیا"

آشا نے جھوٹ بولا "نہیں"۔ اور پھر وُہ رُکتے رُکتے بولی "آپ کا ساتھ تو دینا ہی ہے"۔

دیودت نے پُوچھا۔ "مجبوراً"؟

آشا نے اسی لہجے میں کہا "نہیں مجبوری کس بات کی ہے۔ میرا دھرم بھی تو یہی ہے"۔

دیودت نے کہا "چھوڑو دھرم کرم کی باتیں۔ آج میں اپنے ساتھ وِسکی کی پیٹی لایا ہُوں"۔

آشا خاموش ہی رہی

دیودت پھر بولا "میں نوکروں کے ہاتھ سے نہیں پیوں گا۔ اب یہ بہروپ چھوٹتے چھوٹتے ہی چھوٹے گا۔ تم مجھے پلاؤ گی —— بولو پلاؤ گی نا؟"

آشا کو محسوس ہوا کہ یہ سوال پوچھتے ہوئے دیودت کے چہرے پر اس معصومیت کی ہلکی سی جھلک آ گئی ہے۔ جس کی وجہ سے دیودت اسے اچھا لگا کرتا تھا

لان اور باغیچہ کے پھولوں نے شام کے سرمئی آنچلوں میں اپنے مکھڑے چھپائے تھے اور گول کمرے میں سوڈا واٹر اور وسکی کی بوتل میز پر رکھے دیودت آشا کے چہرے پر نگاہیں جمائے بیٹھا تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا پیگ چڑھا چکا تھا اور آشا کسی ویران کھنڈر میں پنپنے والی خاموشی کو اپنے دماغ میں بسائے دیودت کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی

دیودت پر ہلکا ہلکا سرور طاری ہو رہا تھا۔ برسوں کی دبی ہوئی پیاس شاید آہستہ آہستہ سر اٹھا رہی تھی

دیودت آشا کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ "سچ مچ یہ موتیوں کے آویزے تمہاری خوبصورتی کو چار چاند لگا رہے ہیں۔ جی چاہتا ہے اپنی تمام کائنات تمہارے قدموں پر رکھ دوں۔ تم مجھے پہلے کیوں نہیں مل گئی تھیں آشا! وہ کہ یادرام کتنا اندھا تھا۔ تمہارے جمال کو نہ پرکھ سکا"

اور نہ جانے کب تک ایسی ہی باتیں کرتا کرتا دیودت سو گیا اور آشا دنیا بھر کی مایوسیوں کو اپنے دامن میں سمیٹتے سمیٹتے نڈھال ہو گئی۔ تین برس کا یہ

عارضی سکون آشا کی نگاہوں میں اتنی تیزی سے منزلزل ہونے لگا کہ اس کا شعور واقعات کی تیز رفتاری کا ساتھ دینے سے کترانے لگ پڑا۔

دیودت پہلے تو نوکروں سے چھپ کر آشا کے کمرے میں پیا کرتا تھا اور اب شام ہوتے ہوتے وہ ساغر و مینا لے کر اپنے ڈرائنگ روم میں جم جاتا۔ پہلے دھوتی کرتے کی جگہ اوّل اوّل کھدر کی نیلون اور شرٹ نے لی اور پھر کھدر کے موٹے موٹے جامے عہدِ پارینہ کی یادگار بن کر سیف ٹرنکوں کے اندھیروں میں دم توڑنے لگے۔ آشا یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اور خاموش تھی۔ اسے دنیا کے ذرّے ذرّے سے نفرت ہوتی چلی جا رہی تھی لباس کے معاملے میں اس کی احتیاط کم سے کم تر ہو گئی تھی اور اب میک اپ کئے تو اسے دنوں گذر جاتے تھے۔ ناولوں کا شوق بالکل کم ہو گیا تھا۔ وہ پہروں خاموش بیٹھی اپنے پوجا والے کمرے میں پتھر کی مورتیوں سے سکون کی بھیک مانگتی رہتی۔ مگر پھر بھی اس کی نگاہوں سے ناامیدی کے سائے نہ ڈھلتے

آج صبح سویرے ہی دیودت اسے پکارنے لگ پڑا تھا ——

آسمان ابر آلودہ تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اور دیودت نے پلنگ سے اٹھتے اٹھتے دو جام چڑھا لئے تھے۔ آشا نے اپنے پوجا کے کمرے سے دیودت کی آواز سنی۔ ابھی پوجا ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے سجدوں کو سمیٹ کر دیودت کے حضور میں سر بہ خم ہو جائے یا ان مورتیوں کے آگے سر بہ سجود رہے جن سے

اب بھی اُسے سکون کی اُمید تھی

دیودت دروازے کو زور زور سے ٹھونکنے لگ پڑا ——

تمام کوٹھی میں ہنگامہ سا مچ گیا۔ آشا سہم گئی۔ اس کی پُوجا کے منتر بے ربط ہو گئے۔ اور اُس نے جھنجلا کر دروازہ کھول دیا۔ دیودت کی آنکھیں انگاروں سے بھی زیادہ سُرخ تھیں۔ اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اور ناک پر پسینے کی ننھی ننھی بُوندیں چمک رہی تھیں۔ وہ آشا کو دیکھتے ہی بولا "آج مجھے تم سے کچھ فیصلے کرنے ہیں"

شراب کی بُو نے دیودت کے خشک ہونٹوں سے نکل کر آشا کے ذہن سے دھوپ اور چندن کی اُس تمام خوشبو کو اڑا دیا۔ جو پُوجا کے وقت اس کے دماغ میں بس جایا کرتی تھی۔ وہ سر جھکائے اپنے کمرے میں آگئی

—— دیودت نے ایک کُرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنا جُملہ دہرایا

"آج مجھے تم سے کچھ فیصلے کرنے ہیں"

آشا دیودت کے چہرے کی طرف دیکھنے لگ پڑی

دیودت بولا "پہلے یہ بتاؤ۔ تم روز روز کس کی پُوجا کرتی ہو؟"

آشا خاموش رہی

دیودت کڑکا "تمہیں حق کیا ہے پُوجا کرنے کا؟"

سوال دیودت نے پُوچھا تھا۔ مگر سوالیہ نگاہوں سے آشا دیودت کے چہرے کی طرف دیکھنے لگ پڑی تھی۔ دیودت اپنی آواز کو قابو میں کرتا ہوا بولا "میں تمہارا پتی ہوں۔ تمہارا دیوتا ہوں۔ تمہارا خدا ہوں۔ تم محض میری

پوجا کر سکتی ہو۔ تم محض میرے پاؤں دھو دھو کر پی سکتی ہو"

اس بار آشا نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "مگر دیوتاؤں کی پوجا بھی تو میں آپ کی سلامتی ہی کے لئے کرتی ہوں"

دیودت بہکا۔ "یہ غلط ہے۔ بالکل غلط ہے۔ تم میری پوجا میری سلامتی کے لئے کرو۔ کل سے تم پوجا کے کمرے میں نہیں جا سکتیں"

آشا بے بس سی ہوتی ہوئی بولی۔ "کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

دیودت کی آواز پھر بے قابو ہو گئی۔ "میں کہہ نہیں رہا ہوں۔ میں حکم دے رہا ہوں۔ تمہارا دیوتا تمہیں حکم دے رہا ہے"

آشا نے کرسی سے اٹھ کر دیودت کے پاؤں پکڑ لئے اور وہ گڑگڑا کر بولی۔ "کیا ہوتا جا رہا ہے آپ کو"

دیودت آشا کے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگا جیسے اس نے اپنے بہکے ہوئے جذبات پر قابو پا لیا ہو۔ اور وہ بولا۔ "کچھ نہیں ہو رہا ہے مجھے۔ میں زندگی کے چار دن سنیاسی ہو کر نہیں گذارنا چاہتا۔ میرے پاس روپیہ ہے۔ میری کوٹھیاں ہیں۔ میں لاکھوں کا مالک ہوں۔ پھر میں زندگی کا لطف کیوں نہ اٹھاؤں"؟

آشا پھر گڑگڑائی۔ "آپ کیسے زندگی سمجھنے لگ پڑے ہیں؟ آپ کے خیالات تو بہت بلند تھے"

شراب کے سرور نے دیودت کو شاید بہت حقیقت گو بنا دیا تھا وہ بولا۔ "وہ بہروپ تھا۔ وہ فریب تھا۔ تم میری بیوی ہو میری استاد نہیں

ہو" کہتے کہتے وہ پھر بہاٹ گیا ——— " میرا حکم ماننا تمہارا دھرم ہے - تم بھی سب بہروپ چھوڑ دو - اور زندگی کی چہل پہل میں میرے ساتھ شریک ہو جاؤ - یہ میرا حکم ہے - تمہاری تپسیا یہ نہیں ہے کہ بے جان مورتیوں کے سامنے آنکھیں موندے گھنٹوں خاموش بیٹھی رہو - اور تمہارا جان دار دیوتا اپنی تنہائیوں کو روتا روتا مر جائے - تمہاری تپسیا جانتی ہو کیا ہے ؟ میں تمہیں پلاؤں تم خوشی سے پیو - یہی نہیں ——— میں تمہارے سامنے ہر روز نئی نئی لڑکیاں لایا کرونگا - تم ایک نیک بیوی کی طرح ان کی خدمت کرو گی - تم انہیں سجا بنا کر میرے سامنے پیش کرو گی "

آشا سسکتی رہی اور دیوونت اپنے کمرے میں آ گیا

دوپہر ہو گئی - مگر آشا بغیر کچھ کھائے پئے اپنے بستر ہی پر لیٹی رہی اُس نے سونے کی کوشش کی مگر وہ سو نہ سکی - وہ ٹکٹکی باندھے دیوار پر لٹکی ہوئی کسی گاؤں کی دستی تصویر کو دیکھ رہی تھی - ایک ویران سی جھونپڑی کے باہر ہرے ہرے سبزہ زار میں ہرنی کان اٹھائے حواس باختہ سی افق کی طرف دیکھ رہی تھی - آشا کا تھکا تھکا تصور پر سمیٹ کر اڑنے کی تیاریاں کرنے لگا - وہ چند لمحات کے لئے اپنے ماحول اور اس کے تازیانوں کو بھول گئی - اُسے احساس ہوا - کہ تصویر میں افق کے قریب سے جیسے ہی ایک بھیڑیا ہرنی کی طرف جست لگا کر جھپٹا - اسی وقت ایک درویش صورت انسان اس ویران جھونپڑی سے نکل کر مرغزار میں آ کھڑا ہوا - درویش کے چہرے پر وہ جلال تھا کہ بھیڑیا سہم کر افق کے پردوں

کے پیچھے جا چھپا۔ اور ہرنی اپنے محسن کے قریب سر جھکائے آ کھڑی ہوئی۔ درویش نے اپنے طویل لبادہ میں سے ایک سونے کی زنجیر نکال کر ہرنی کے گلے میں ڈال دی۔ ہرنی کی آنکھوں میں درویش کے لئے محبت کی جوت روشن ہو گئی اور اس نے جذبۂ عقیدت سے مغلوب ہو کر اپنا سر درویش کے قدموں پر رکھ دیا۔ مگر چند ہی لمحات بعد ہرنی کے خواب چکنا چور ہو گئے۔ درویش نے اس بار اپنے طویل لبادہ میں سے ایک چمکدار چھری نکال لی تھی اور اب قہر آلودہ نگاہوں سے ہرنی کی طرف دیکھ رہا تھا اور افق کے قریب بھیڑیا چنگھاڑ چنگھاڑ کر قہقہے لگا رہا تھا۔ اس کے بعد آشا کا تصور مفلوج ہو کر رہ گیا ــــــ دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویر اسے گھومتی نظر آنے لگی۔ اور اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

آنسوؤں کے گرم گرم نقرئی قطرے اس کی آنکھوں سے ابل کر رخساروں پر پھیلتے ہوئے اس کے موتیوں کے آویزوں میں الجھ گئے۔

دیودت کا نشہ اتر چکا تھا۔ اور اب وہ آشا کے کمرے میں خاموش آ کھڑا ہوا۔ آشا کے آویزوں پر اس کی نگاہیں جم گئیں۔ آشا آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ اسے دیودت کی آمد کی کچھ بھی خبر نہ تھی۔ دیودت صبح کو پیدا ہونے والی تلخیوں کو ایک سرے سے بھلاتے ہوئے بڑبڑایا۔ "بہت تکلیف ہے تمہیں"

آشا کی اشک ریز آنکھیں کھلیں۔ دنیا بھر کی بے بسی کو سمیٹتے ہوئے اس کی نگاہیں دیودت کی طرف اٹھ گئیں۔

دیودت گھمبیر آواز میں بولا " شراب کے نشہ میں کہی ہوئی باتوں کا بُرا نہیں مانا کرتے " ۔ آشا جوں کی توں لیٹی رہی ۔

دیودت اس کے قریب آتا ہوا بولا " اٹھو بھول جاؤ صبح کی باتیں "

آشا اُٹھ بیٹھی

دیودت اُسے کلائی سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا " نہ جانے کس خوش نصیب کے آنسو تمہارے کانوں میں موتی بن کر جگمگا رہے ہیں "

آشا کی نظروں میں دیودت کے چہرے کی معصومیت کا فریب کتنے ہی دنوں سے دھلتا جا رہا تھا اور اب ایسی باتیں اس کی دلجوئی کرنے سے قطعی قاصر تھیں ۔ وہ اٹھی اور بغیر کچھ کہے سُنے ہاتھ منہ دھونے غسل خانہ کی طرف چل دی

شام ہوتے ہوتے آشا کی طبیعت میں زمین آسمان کا فرق پڑ چکا تھا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بار اُس نے پھر ان تمام الجھنوں سے لوہا لینے کا فیصلہ کر لیا ہے ۔ جو اس کے سکون کے ٹکڑے اڑا دینا چاہتی تھیں ۔ اب اُس کی آنکھوں میں عزم کی جوت جگمگا رہی تھی ۔ اس کے رخساروں پر استقلال کی سُرخی چھا رہی تھی ۔ اور اس کے تیور صاف کہہ رہے تھے کہ زندگی کی آخری لڑائی لڑنے کے لئے اُس نے اپنی تمام جرأتوں اور تمام حوصلوں کی بازی لگا دی ہے ——— وہ ایک شاطر جواری کی طرح ہزاروں عزائم اپنے دھڑکتے ہوئے سینے میں لے کر پھر میدانِ کارزار میں اتر آئی تھی ———

اندھیرا ہوتے ہوتے اُس نے آج دیودت سے خود پوچھا۔ "سامان تیار کروں؟"

دیودت ہکا بکا سا اُس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

ہزاروں معصومیتیں آشا کے عنبریں ہونٹوں پر بکھرتی ہوئی مسکراہٹ کی بلائیں لے رہی تھیں جب وہ بولی "۔ اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے؟

——— میرے دیوتا کو جو چیز پسند ہے میں وہی نذر کرونگی"

دیودت آشا کے مزاج کے اس تغیر کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔ "تم رہنے دو۔ نوکر لے آئیں گے سامان"

آشا بغیر کچھ جواب دئے اپنے سر کو خفیف سا جھٹکا دے کر ساغر و مینا کا اہتمام کرنے خود چل پڑی

دیودت پی رہا تھا۔ آشا نے ریڈیو گرام کے سینہ کو گدگدا کر ماحول میں سُریلے نغمے چھڑک دئے تھے۔ اُس نے آج بڑی احتیاط سے میک اپ کیا تھا۔ اور آج کی رات کے لئے سُرخ ریشمی لباس منتخب کیا تھا۔ دیودت پیتا پیتا جب مسرور ہو جاتا تو والہانہ انداز سے آشا کے چہرے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتا

دیودت معمول سے زیادہ پی گیا اور معمول سے زیادہ بہک گیا۔ وہ آشا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تمہارے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں اچھی لگتی"

آشا نے دیودت کی طرف متبسّم نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تو؟"

دیودت نے شاعرانہ انداز میں کہا۔ "حسن کی نگاہوں میں آنسو کنول کی پنکھڑیوں پر بکھرتے ہوئے شبنم کے قطروں سے بھی زیادہ حسین معلوم ہوتے ہیں"

آشا مسکراتی رہی۔

دیودت بہکتا بہکتا پھر بولا ــــ "آشا! اب تم اتنی حسین بھی نہیں رہی ہو۔ تمہیں اس کوٹھی کی رہائش نے موٹی بنا دیا ہے۔ تم بھدّی ہو گئی ہو!"

آشا ہزاروں تلخیاں حلق کے نیچے ہی نیچے دباتی ہوئی بھی مسکرا رہی تھی

دیودت ایک پیگ اور انڈیلتا ہوا بولا۔ "وہ تمہاری نوکرانی ہے نا" لاجو" وہ تم سے زیادہ حسین ہے۔ اس کے باریک ہونٹ۔ اس کے خمدار ابرو۔ اس کے رسیلے رخسار۔ کہاں ہے لاجو ــــــــ؟ بلاؤ ذرا لاجو کو۔۔۔۔ ہم اپنے ہاتھ سے اُسے آج جام پلائیں گے"

آشا دیودت کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو

دیودت نے اصرار کیا۔ "بلاؤ نا لاجو کو!"

آشا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "۔ لاجو چلی گئی ہے۔ اٹھئے اب آپ کھانا کھا لیجئے!"

دیودت نے ضد کی۔ "ہم کھانا نہیں کھائیں گے۔ ــــــ ہم لاجو کو دیکھیں گے۔ اُسے بلاؤ"

آشا منت کرتی ہوئی گویا گڑگڑا سی پڑی "۔ لاجو اپنے کوارٹر میں چلی گئی ہے"

دیودت کڑکا۔ "تم جھوٹ بول رہی ہو۔ تمہیں یہ خوف ہے کہ کہیں لاجو تمہاری جگہ نہ لے لے۔ مجھے اب تم سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے۔ تم میری

خوشیوں کے راستہ میں نہ آؤ"

نوکر کمرے میں داخل ہو کر مودّب کھڑا ہو گیا

دیودت نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے پُوچھا۔ "کیا بات ہے"؟

نوکر نے کہا۔ "سر شیتل پرشاد آئے ہیں"

دیودت کے نشے کو گویا آناً فاناً لگام لگ گئی۔ وہ اٹھتا ہوا بولا

"کہاں ہیں"؟

نوکر نے دیودت کے راستے سے کرسی ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔ "گول کمرے میں ہیں"

دیودت چلا گیا۔

آشا کی نگاہوں کے سامنے سے تصنع کا ایک اور پردہ سرکنے لگا دیودت وہ سب باتیں نشہ میں کر رہا تھا۔ یا اس کی یہ سنجیدگی بناوٹ تھی کیا وہ اس سے جان چھڑانے کے لئے یہ سب بہروپ بنا رہا ہے۔

آشا نے تنکا تنکا کر کے اپنی جراتوں کا جو شیرازہ اکٹھا کیا تھا اب اُسے بکھرتا نظر آ رہا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھی بیٹھی نڈھال سی ہو گئی۔ اُسے خود پر ترس آتے آتے نفرت ہونے لگی۔ اور دفعتاً ایک بار پھر بھنور میں پھنس کر بھی زندہ رہنے کی ہلکی ہلکی سی شعاع اس کے ہونٹوں پر جراٴت کی پرچھائیں بن کر لہرا اٹھی

دیودت سر شیتل پرشاد سے باتیں کرنے کے بعد کھانے کی میز پر جا بیٹھا تھا۔ نوکر آشا کو بلانے گیا وہ اٹھی اور کھانے کی میز پر جا بیٹھی۔ اب

وہ ایک بے حس مشین کی طرح حرکت کر رہی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد دیودت اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور وہ لباس تبدیل کر کے اپنے پلنگ پر دراز ہو گئی۔ وہ آج کے واقعات قطعی بھلا کر سو جانا چاہتی تھی۔ مگر نیند اس کی پلکوں کو نوازنے سے منکر تھی۔ جو بھی یاس آفریں خیال اس کی سطح ذہن سے ابھرتا وہ اسے وہیں دبا دیتی۔ جیسے جیسے وقت گذرتا جاتا تھا آشا کی کروٹیں بستر کی شکنوں میں اضافہ کرتی چلی جا رہی تھیں

اس نے بجلی بجھا دی۔ مگر تاریکی بھی اسے نیند کا پیغام نہ دے سکی

——— اچانک اسے دیودت کے کمرے سے کچھ سرسراہٹ کی آواز آئی۔ وہ چونک پڑی۔ آواز خاموش ہو گئی تھی۔ اسے اپنے وسوسوں پر جھنجلاہٹ سی ہوئی۔ اچانک پھر ویسی ہی آواز تاریکیوں کو چیرتی ہوئی اس کے کانوں میں خراش پیدا کرنے لگی۔ وہ اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آواز پھر خاموش ہو چکی تھی۔ مگر اس بار جب وہ دوبارہ لیٹنے ہی والی تھی پھر ویسی ہی آواز نے اسے چوکنا کر دیا ——— دبے پاؤں اٹھی اور اپنے کمرے سے نکل کر دیودت کے کمرے کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اب آواز صاف تھی اور تیز تھی۔ اس نے دروازے میں چابی لگانے والے سوراخ پر اپنی آنکھ چسپاں کر دی۔ اس کے پاؤں کانپنے لگے۔ لاجو دیودت کے کمرے میں تھی۔ وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے اپنے کمرے میں واپس لوٹ آئی اور تاریکی میں اپنے پلنگ کو تلاش کرتی کرتی اس پر نڈھال ہو کر آ گری۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دیودت کی فطرت میں یہ انقلاب کیا

بنا تھا یا وہ شروع ہی سے ایسے کردار کا مالک تھا اور پہلے والی وہ شرافت ——— وہ رُک رک کر بولنا ۔ وہ سنجیدگی ایک ایسا ڈھونگ تھی جس نے اس کی رہی سہی پونجی کو بھی لوٹ لیا تھا

وہ رونا چاہتی تھی مگر اب شاید آنسو بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے

صبح ہو گئی ۔ لاجو اس کے کمرے میں چائے لے کر آئی ۔ اُس کے چہرے پہ وہی بھولا پن ۔ وہی معصومیت ۔ وہی بے چارگی تھی ۔ آشا لاجو سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی ۔ مگر بہت کم کہہ سکی

اُس نے پوچھا ۔ "صاحب اٹھ گئے ہیں ؟"

لاجو نے سر جھکائے جواب دیا ۔ "مجھے تو معلوم نہیں بی بی جی ! میں تو کبھی ان کے کمرے کے پاس سے ہو کر نہیں نکلتی ۔ مجھے تو ان سے ڈر لگتا ہے"

آشا نے کہا ۔ "لاجو اُن سے ڈر تو مجھے بھی لگتا ہے"

لاجو نے کہا ۔ "آپ کو کیوں ڈر لگتا ہے بی بی جی ! آپ تو گھر کی مالکن ہیں"

آشا نے کہا ۔ "صاحب کا مزاج بہت سخت ہے نا ؟"

لاجو نے کہا ۔ "اُن کا مزاج ہم لوگوں کے لئے سخت ہے بی بی جی ! آپ کے سامنے تو صاحب پانی بھرتے ہیں"

سینکڑوں لاچاریوں ۔ ہزاروں تلخیوں اور لاکھوں مایوسیوں کو اپنے بوسیدہ دامن میں سمیٹے ایک غزال آفریں مسکراہٹ آشا کے لبوں پہ چھا گئی

لاجو کرسیوں پر کپڑا پھیرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی

منصوری کی فلک شگاف چوٹیوں پر سیہ گھٹاؤں نے دبیز لحاف ڈال دیا تھا۔ گھاٹیاں ابر پاروں سے بھری ہوئی تھیں اور آشا کوٹھی کے اسی دالان میں بیٹھی گھٹتے بڑھتے اندھیروں پر ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی جہاں کچھ برس پہلے اسے دیودت کی رفاقت میں اپنی نجات کا راستہ دکھائی پڑا تھا۔ وہ اچانک ہی منصوری آگئی تھی — دلّی کے موسم گرما سے ایک دن دیودت کی طبیعت دفعتاً اکتا گئی۔ اور چند گھنٹوں میں سامان سفر بندھ گیا۔ اگلے دن صبح آشا دیودت اور آدھی درجن نوکر منصوری کی اس پرانی کوٹھی میں براجمان تھے۔ جس دن سے یہ لوگ یہاں پہنچے تھے دیودت نے پینے کی انتہا کر دی تھی۔ وہ صبح تو دو ایک پیگ ہی چڑھاتا۔ مگر جیسے جیسے شام کے دھندلکے چھاتے چلتے اس کا دماغ شراب کے زور سے دبتا چلا جاتا مگر اب وہ پینے کے بعد آشا سے کسی قسم کی بحث نہ کرتا۔ وہ اکثر خاموش رہتا اور کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ اس کی خاموشی میں اس کی کونسی تجویزیں جنم لے رہی ہیں۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب پرہول سی سنجیدگی تیرتی رہتی۔ دوپہر کو وہ ہر روز یا تو اکیلا کسی سینما میں نکل جاتا یا سویا رہتا۔

دیودت کی یہ خاموشی آشا کے لیے روز بروز تلخ ہوتی جا رہی تھی اس کی نگاہوں میں اس کا مستقبل بالکل غیر یقینی ہو چکا تھا۔ دو ایک دفعہ اس نے دیودت سے خود بات چھیڑنے کی کوشش کی مگر دیودت کی چپ نے آشا

کو کسی فیصلے پر پہنچنے کا موقع ہی نہ دیا۔ وہ اب کھانا بھی اکیلا ہی کھاتا تھا۔
رات کو شراب کا سامان بھی نوکروں ہی سے منگوا لیتا تھا

اس دن جب آشا صبح اٹھی اس نے دیکھا کہ کوٹھی بالکل ویران ہے۔
اتنا ساز و سامان رات رات ہی میں نہ جانے کہاں چلا گیا تھا آدھی درجن نوکر
نہ جانے کہاں گم ہو گئے تھے۔ اس کا ایک چھوٹا سا سوٹ کیس اس کے
پلنگ کے قریب ہی رکھا تھا۔

آشا گھبرا گئی۔ وہ سلیپر پہن کر کمرے سے باہر نکلی اور گیلری میں ہوتی
ہوئی ایک ایک کمرہ دیکھنے لگی۔ اس کے خوابوں کی طرح سب ویران تھے۔
وہ کوٹھی کے باہر آئی۔ پھاٹک کے قریب دیو دت کی پسندیدہ 'بیوک' موٹر
کھڑی تھی مگر ڈرائیور کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ پھر کوٹھی میں واپس لوٹی اور پھر
ایک ایک کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ دالان کے ساتھ والے کمرے میں اسے
کچھ آواز سنائی دی۔ وہ ادھر لپکی۔ دیو دت آدھی سے زیادہ بوتل ختم کر چکا
تھا۔ آشا چپ چاپ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

دیو دت بھی چپ چاپ بیٹھا رہا۔

آشا نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا "کہاں گئے سب
لوگ؟"

دیو دت بوتل کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "ہر روز ایک ہی نظارہ دیکھتے دیکھتے
میری طبیعت اچاٹ ہو گئی ہے۔ آج ہم منگروت کے پہاڑوں پر جائیں گے۔ یہ
فیصلہ میں نے رات کیا تھا۔ صبح چار بجے ہی سب نوکروں کو روانہ کر دیا گیا

ہے۔ تمہارا سامان بھی بھیج دیا گیا ہے۔ آج کے کپڑے تمہارے سوٹ کیس میں ہیں اور وہ تمہارے سرہانے رکھا ہے۔"

آشا نے پوچھا۔ "ڈرائیور کہاں ہے؟"

دیودت نے ایک اور پیگ چڑھاتے ہوئے کہا۔ "آج ہم دونوں اکیلے سفر کریں گے۔ ڈرائیور کو بھی میں نے صبح سامان کے ساتھ بھیج دیا ہے۔"

آشا خاموش رہی۔

دیودت پھر بولا۔ "جاؤ جلدی تیار ہو جاؤ۔"

آشا نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "مگر آپ نے بہت زیادہ پی لی ہے۔"

دیودت کے لبوں پر ایک کڑوی مسکراہٹ تلملا گئی۔ وہ بولا۔ "کبھی شراب بھی زیادہ ہوتی ہے؟"

آشا چپ چاپ اپنے کمرے میں آ گئی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ دیودت کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی منصوری کی بلندیوں کو الوداع کہہ رہی تھی۔ اُسے تعجب تھا کہ اتنی پی لینے کے بعد بھی دیودت کے ہوش و حواس قائم تھے اور وہ نہایت ہوشیاری سے موٹر ڈرائیو کر رہا ہے جب تک پہاڑوں کے موڑ توڑ نہ ختم ہو گئے اور ادا جپور کا میدانی علاقہ شروع نہ ہو گیا۔ دیودت نے آشا کی طرف رجوع نہ کیا اور نہ ہی آشا دیودت سے کچھ بولی۔

اچانک دیودت بولا۔ "آشا"!

آشا دیودت کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

دیودت پھر بولا۔ "آج سے میں شراب نہیں پیونگا۔"

آشا کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا

دیودت نے پھر کہا۔ "آج سے سچ مچ میں شراب نہیں پیوں گا۔ آج آخری دن تھا میری مے پرستی کا۔ دیکھتی نہیں ہو شراب کی بھری ہوئی میں میں ویران کوٹھی میں چھوڑ آیا ہوں۔"

آشا کے فکر آلودہ چہرے پر امید کی ایک کرن چھا گئی

دیودت نے پھر پوچھا۔ "تمہیں معلوم ہے میں کب سے پیتا ہوں"

آشا نے کہا۔ "نہیں"

دیودت بولا۔ "گیارہ سال سے۔ اور آج گیارہ برسوں کی عادت کو میں نے ایک لمحہ میں چھوڑ دیا ہے۔"

آشا نے پوچھا۔ "کتنے دنوں کے لئے؟"

دیودت نے آشا کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہمیشہ کے لئے۔"

آشا نے کہا۔ "میرے آنے سے پہلے اور میرے آنے کے کچھ دنوں بعد تک بھی تو آپ نہیں پیتے تھے۔"

دیودت نے موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔ "کون کہتا ہے کہ میں نہیں پیتا تھا تم نہیں سمجھ سکیں تو میرا کیا قصور ہے۔"

آشا نے متعجب لہجہ میں پوچھا۔ "آپ سچ مچ پیتے تھے؟"

دیودت نے کہا۔ "بالکل سچ۔ مگر ان دنوں میں کم پیتا تھا اور چھپا کر پیتا

تھا۔ مجھے کاروبار کے لئے پینا پڑتا تھا۔ اور پینا کھلے بندوں شراب نہیں پیا کرتے "۔

آشا نے کہا "مگر آپ کو معلوم ہے ان دنوں میرے اوپر کیا بیتی ہے"

دیودت خاموش رہا

آشا نے پھر کہا "مگر کس چیز نے آج آپ کو شراب چھوڑنے پر مجبور کر دیا ہے "؟

دیودت نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا "زندگی کو والہانہ امنگوں کے سپرد ہمیشہ کے لئے تو نہیں کیا جا سکتا ہے۔ میرا لڑکا ہری اب پندرہ برس کا ہو گیا ہے اور میری اپنی جوانی اب ڈھلنے لگ پڑی ہے "

آشا نے کچھ سوچتے سوچتے کہا "مگر آج ہی آپ کو یہ خیال کیوں آیا "؟

دیودت نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا "اس فیصلے پر پہنچنے کے لئے مجھے ایک برس جدوجہد کرنی پڑی۔ اور آج میں اسی جدوجہد میں کامیاب ہوا ہوں "

آشا بڑی گہری سوچ میں پڑ گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر کہنے سے مجبور ہے۔ وہ ایک بار اس نے دیودت کی طرف دیکھا بھی لیکن اس کے ہونٹ پھڑک کر ہی رہ گئے

بالآخر دیودت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے "؟

آشا نے ڈرتے ڈرتے کہا "اگر آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات اور پوچھوں "؟

دیودت نے ماتھے پر بکھری ہوئی زلفوں کو پیچھے جھٹکتے ہوئے کہا۔" ما
ہونے کے دن گئے۔ تم کہو جو کچھ بھی کہنا چاہتی ہو"

آشا کے چہرے پر اُمید کی ایک اور کرن دوڑ گئی۔ اُس نے جھجھکتے جھجھ
کہا۔" میں لاجو کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتی ہوں"

دیودت نے ایک بار پھر آشا کی طرف گھور کر دیکھا اور وہ بولا۔" بتا
اُس نے تمہیں سب کچھ؟ بڑی حرام زادی ہے"

آشا نے کہا۔" اُس نے مجھے کچھ نہیں بتایا ہے"

دیودت آشا کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اُٹھا۔" تو تم بہت
ذہین ہو۔ ہاں! لاجو کے ساتھ میرے تعلقات رہے ہیں۔ پہل میں نے ہی
کی تھی۔ یہ تعلقات گیارہ سال سے زیادہ چلے"

آشا کے جذبات تلملا اٹھے۔ مگر اس کا چہرہ سنجیدہ ہی رہا

دیودت پھر بولا۔" اور اب ایک لاجو کیا لاکھ لاجو بھی مل کر آئیں تو
مجھ پر کوئی اثر نہ ہوگا"

آشا خاموش ہی رہی

دیودت پھر بولا۔" میرے تعلقات لاجو سے تھے۔ اس میں زمانہ ک
اعتراض کیوں؟ مجھے عورت کی ضرورت تھی"

آشا بے چین ہوتی ہوئی بولی" مگر میرے آنے کے بعد بھی آپ
—————"

دیودت بولا۔" تم آئیں کب میرے پاس۔ تمہاری رُوح تو ہمیشہ اپ

ہی اُلجھنوں میں پھنسی رہی اور لاجو مجھے اپنی رُوح۔ اپنا جسم۔ سب کچھ ہی دیتی رہی ۔"

آشا چُپ ہو گئی اور پھر گویا دفعتاً لاکھوں ارمان اس کے لہجے میں لرزاں رہے تھے جب وُہ بولی "مگر آپ تو امید کا دیپک لے کر میری بھٹکی ہوئی رُوح کو شانتی کا پیغام دینے کے لئے آئے تھے"

دیودت خاموش رہا

آشا پھر بولی۔"میں تو کبھی سوچ ہی نہیں سکتی کہ آپ جیسے دیوتا بھی جسموں کے پجاری ہوتے ہیں "

دیودت محض اتنا بولا۔ "مجھے اس کا دکھ ہے"

آشا نے کہا "مگر اتنا کہہ دینے سے میرے جیون کی اُلجھنیں تو نہیں سُلجھ سکتیں"

دیودت نے پھر سر کے بالوں کو پیچھے جھٹکتے ہوئے محض اتنا ہی کہا "ہم بیوپاری ہیں"

آشا کے چہرے پر یک لخت ہزاروں حسرتیں چھا گئیں وہ بولی "ایسے نہ کہیئے ——— اتنا سچ نہ بولئے کہ میرا کوئی بھی سپنا زندہ نہ رہ سکے"

دیودت نے کہا "یہی تو میں کہنا چاہتا تھا۔ ہم بیوپاری ہیں۔ ہم سپنے نہیں بناتے۔ ہمیں جو کچھ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ کرتے ہیں"

آشا گڑگڑاسی پڑی "دیکھئے میرے پتا جی نے آپ پر کتنا اعتبار

گیا ہے —— وہ بہت شریف ہیں۔ انہیں دُنیا کا کوئی ہیر پھیر نہیں آتا"

دیودت بولا" اسی لئے تو قدرت ہمیشہ ان کی مدد کرتی رہی ہے
انہیں فالج ہوا۔ میں نے پانچ ہزار روپیہ بھیج دیا۔ چیک تو انہوں نے اپنے دستخط کر کے ہی کیش کرایا ہوگا۔ اور پھر تم بھی ان کی مدد کرتی رہی ہو"
آشا کا چہرہ بہت زرد ہو گیا اور وہ کانپتے ہوئے لہجہ میں بولی "تو اس لئے کی تھی آپ نے پتاجی کی مدد"؟

دیودت کے اس جواب میں ہزاروں نشتروں کی چبھن تھی "میں غریب کسی کی کیا مدد کر سکتا ہوں"

آشا چپ ہو رہی
اور کچھ دیر بعد وہ اچانک گھبرائی ہوئی آواز میں بولی "تو کیا فیصلہ کیا ہے آپ نے میرے بارے میں"؟

موٹر ڈیرہ دون کے فینسی بازار میں سے گذر رہی تھی اور دیودت کو بھیڑ میں سے گاڑی نکال لینے کے لئے احتیاط برتنی پڑ رہی تھی۔ اس کا ہاتھ اسٹرینگ پر سے اٹھ کر بار بار ہارن کی طرف اٹھ رہا تھا۔ اس نے گاڑی ایک خوبصورت کپڑے کی دوکان کے سامنے کھڑی کر دی۔ اور آشا کی طرف کا دروازہ کھول کر اسے گاڑی سے اترنے کی درخواست کرنے کے بعد خود دکان میں داخل ہو گیا ——

نوجوان بزاز نے ساڑھیوں کے ڈھیر لگا دئے اور دیودت آشا سے

بہترین سے بہترین ساڑھی کا انتخاب کر رہا تھا۔ ریشم کے اس چھوٹے سے ڈھیر نے آشا کے تمام خدشات۔ تمام وہم۔ تمام وسوسے اپنے تلے دبا لئے تھے۔ اب اس کے لبوں پر شمشانوں کی وہ مایوسی نہ تھی بلکہ ایک بھینی بھینی سی مسکراہٹ تھی۔ اس کے رخساروں پر چھلکنے والی اُمیدوں کی شادابی تھی اور اس کی آنکھوں میں بہاروں کا کیف تھا ——— بزاز کے نوکر نے درجن بھر ساڑھیاں۔ جمپروں کے کپڑے۔ لیٹر بیڈ گاؤن اور ایسا ہی اور سامان موٹر میں رکھ دیا

دیودت نے موٹر میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اب چلو کھانا کھالیں"

اور ایک خوبصورت ریسٹوران میں کتنے ہی دنوں بعد آشا نے دیودت کے ساتھ سیر ہو کر کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد دیودت موٹر میں بیٹھتا ہوا بولا۔ "بہت دن ہو گئے ہیں پکچر دیکھے ہوئے۔ چلو میٹنی شو دیکھیں"

آشا کی روشن نگاہوں میں ہلکی سی شرارت نے بل کھایا وہ بولی "تو یہ ہے آپ کا چکر ورنہ پہاڑ"

دیودت محض مسکرا دیا

آشا پھر بولی "آپ کو پریشان کرنے میں مزا آتا ہے۔ ایک لمحہ میں آپ انسان کو دوزخ کی گہرائیوں میں جھونک دیتے ہیں اور دوسرے ہی لمحہ اُسے آسمان پر بٹھا دیتے ہیں"

دیودت محض مسکرا دیا۔

پکچر ختم ہونے کے بعد دیودت کار کے پاس آتے آتے بہت سنجیدہ ہو گیا

آشا نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہی فیصلہ کر لیا کہ اب وہ دیودت کو اپنے ارمانوں سے مزید نہ کھیلنے دے گی۔

اس نے دیودت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" آپ تو چکروتہ کی بجائے ہردوار کی طرف چل پڑے"!

ایک بہت ہلکی سی مسکراہٹ نے دیودت کے لبوں کو چوم لیا۔ وہ بولا۔ "پندرہ برس کے پاپوں کو آج گنگا کی لہروں کے حوالے کرنا ہے"!

آشا نے کہا "چکروتہ میں سب لوگ ہمارا انتظار کر رہے ہونگے"!

دیودت نے جواب دیا۔" چکروتہ بھی پہنچ جاؤنگا۔ میں نے انتظار کرنے والوں کا کبھی دل نہیں توڑا ہے۔ جلد یا دیر میں ان کے پاس ضرور پہنچ جاتا رہا ہوں"!

آشا نے "جی ہاں" کچھ اس لہجہ میں کہا کہ گویا اسے دیودت کی بات کا یقین نہیں آرہا ہے۔

دیودت چُپ رہا۔

آشا نے مزید شرارت کی۔" وہ لاجو بھی آپ کا انتظار کر رہی ہو گی"!

دیودت نے آشا کی طرف دیکھا اور اسٹرینگ گھماتا ہوا بولا۔" یہ بتانا میں بھول ہی گیا۔ لاجو کو میں نے آج صبح چار بجے نکال دیا ہے۔ ڈرائیور اسے یہاں ڈیرہ دُون کے اسٹیشن ہی پر چھوڑ کر چکروتہ چلا گیا ہوگا۔ رات کو نو بجے جاتی ہے اس کی گاڑی۔ رو رہی ہو گی حرام زادی اسٹیشن پر بیٹھی"!

آشا "بے چاری لاجو" کہہ کر خاموش ہو گئی۔ وہ ڈوبتے ہوئے سورج

کی سُرخ شعاع تھی یا آمد سکون کی پُر کیف جھلک جس سے آشا کے چہرے کی تابانی میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔

آشا نے یک لخت پُوچھا "یہ ہم کہاں آ گئے ؟"

دیو دت کے سنجیدہ لبوں سے الفاظ اُبلے۔ "وہ سامنے اسٹیشن ہے۔"

آشا نے متعجب لہجہ سے پُوچھا "کس کو لینے آئے ہیں آپ ؟"

دیو دت نے گردن گھما کر جواب دیا "نہیں! آپ کو چھوڑنے آیا ہوں"

آشا پہلے تو کچھ گھبرائی مگر پھر متبسم لبوں سے بولی۔ "مذاق چھوڑیئے یہاں کیا رکھا ہے۔ جہاں چلنا ہو چلیئے"

دیو دت کی بھاری آواز لہرائی۔ "نہیں آشا تمہیں جانا ہو گا۔ تمہاری اُلجھنوں کا علاج میرے پاس نہیں ہے"

آشا ویران ویران نگاہوں سے دیو دت کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ "کہاں جاؤں میں ؟"

دیو دت کا چھوٹا سا جواب تھا۔ "پتا جی کے پاس"

آشا نے مریل سی آواز میں پُوچھا۔ "اور آپ ؟"

دیو دت کے لہجہ میں چٹانوں کی سختی تھی۔ "میں رات کو یہاں کہیں ہوٹل میں رہونگا۔ صبح ہری اپنی ماں کے ساتھ آ رہا ہے۔ چودہ برس بعد آ رہی ہے ہری کی ماں۔ انہیں لے کر مجھے صبح چکر دوتہ جانا ہے!!"

آشا موٹر کی کھڑکی کھول کر اُتر پڑی

دیودت بھی گاڑی سے اترتا ہوا بولا "اسٹیشن پر راجو تمہارا سامان لئے انتظار کر رہا ہوگا!"

آشا نے دیودت کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جن میں چکنا چور ہو جانے کے بعد بھی زندہ رہنے کا عزم اجاگر تھا۔ دیودت کچھ جھینپ سا گیا ——

آشا بولی "مجھے آپ کے کسی سامان اور نوکر کی ضرورت نہیں۔"

دیودت خاموش رہا۔

آشا پھر بولی "آپ میری طرف سے ہر بچی کی ماں کو یہ تحفہ دے دیجئے گا۔" اور اتنا کہہ کر اس نے موتیوں کے آویزے کانوں سے اتار کر دیودت کی طرف بڑھا دئے

دیودت گاڑی کا سہارا لئے فولادی بت کی طرح خاموش کھڑا رہا۔ آشا نے آویزے پچھلی سیٹ پر رکھے ہوئے ساڑھیوں کے ڈبے پر پھینک دئے اور اسٹیشن کی طرف چل دی

اور جب راجو آشا کو ایک خالی زنانہ ڈبے میں بٹھا کر چلا گیا تو سہمی سہمی ہوئی لاجو اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔ "بی بی جی! مجھے تو صاحب نے نکال دیا۔"

آشا خاموش رہی۔

لاجو نے پھر پوچھا۔ "بی بی جی! آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

آشا کی آنکھوں سے دو موتی ٹوٹ کر اس کے آنچل میں آگرے۔

انسانی زندگی کے تضاد کا ایک گہرا اور بھرپور مطالعہ

جس میں ان گنت رنگین و سنگین حقائق کا دل دھڑک رہا ہے

حسن اور موت

رنگ اور آگ میں ڈوبی ہوئی ایک طویل داستان

جو

آپ کے محبوب فن کار نیاز شرما کے

مہکتے اور دہکتے ہوئے مشاہدات کا عظیم اور تاریخی مرقع ہے

قیمت اڑھائی روپے

ظالم اور خونخوار طاقتوں کے خلاف ——

دہشت اور غارت گری کے خلاف ——

فاشزم اور شہنشاہیت کے خلاف ——

—— جب کروڑوں عوام سینہ سپر ہوتے ہیں ——

اس وقت —— جمہوریت اور انصاف اور سچائی کی حفاظت کے لئے ——

عوامی شاعروں کے قلم بھی سر اٹھاتے ہیں ——

دنیا بھر کے آٹھ نامور اور نمائندہ عوامی شاعروں کی جمہوری نظموں کا مجموعہ

للکار

جسے ملک کے مقبول شاعر نریش کمار شاد

نے شعری قالب میں ڈھال کر ہندوستانی عوام کے سامنے پیش کیا ہے۔ یہ وہ منتخب نظمیں ہیں جنھوں نے ہر دور میں آزادی پسند عوام کا لہو گرمایا ہے اور جمہوری جد و جہد اور آزادی کے حصول میں مشعل راہ کا کام دیا ہے۔ شاعروں کے سوانح حیات اور تصویروں کے ساتھ

قیمت دو روپے